تذکرہ
شعرائے اودے پور

مرتّب :

شاہد عزیز

راجستھان اردو اکادمی جے پور

تذکرہ شعرائے اُودے پور

شاہد عزیز

RAJASTHAN URDU ACADEMY

J-3, SUBHASH MARG,"C" SCHEME, JAIPUR-302001

Ph: 0141- 382664-

Tazkera Shora-e- Udaypur(Urdu Poetry)

Edited by Shahid Aziz. Price: 80

تذکرہ

شعرائے اُودے پور

ترتیب

شاہد عزیز

راجستھان اُردو اکادمی

جے / ۳، سبھاش مارگ، سی اسکیم، جے پور (راجستھان)

سلسلہ مطبوعات راجستھان اردو اکادمی

نام کتاب .... تذکرہ شعرائے اودے پور

مرتب .... شاہد عزیز

سن طباعت ۲۰۰۰ء

مطبع .... ایم، آر آفسیٹ، دہلی

کتابت .... گلوبل اردو کمپیوٹرس، رام گنج بازار، جے پور

قیمت ۸۰/روپے

معظم علی سکریٹری راجستھان اردو اکادمی جے پور نے نازش بک سینٹر دہلی کے توسط سے ایم، آر آفسیٹ پریس میں طبع کرا کے دفتر اکادمی، جے، ۳۔ سبھاش مارگ، سی، اسکیم، جے پور سے شائع کیا۔

فہرست

پیش لفظ

راجستھان بڑا مردم خیز خطّہ ہے: حالانکہ اناج کے معاملے میں اسے ریگستان کہا جاسکتا ہے لیکن ادیبوں اور شاعروں کے حوالے سے یہ ہمیشہ نخلستان بنا رہا۔ یہاں کے ادیب، شاعراور ناقد اردو ادب کی تاریخ کے روشن ستارے ثابت ہوئے ہیں۔ اگر ایک طرف حافظ محمود شیرانی، اختر شیرانی، عصمت چغتائی، عظیم بیگ چغتائی، بسمل سعیدی، مخمور سعیدی، ش ک نظام موجودہ دَور کے اہم نام ہیں، جن کے ادبی کارناموں کا سبھی نے اعتراف کیا ہے، تو دوسری طرف عہدِ قدیم میں اکبر علی خاں گُل، مولانا تسلیم، مرزا مائل، مولانا مبین، مولانا کوثر، منشی چاند بہاری لال صبا، مولانا قمر واحدی جیسے اعلیٰ شعرا کی خدمات اور فنّی مہارت کے بھی سبھی قائل رہے ہیں۔

حکومتِ راجستھان نے ۱۲ر فروری ۱۹۷۹ء کو راجستھان اُردو اکادمی کا قیام صوبے میں اردو زبان وادب کے فروغ اور یہاں کے شعری وادبی سرمایے کی ترویج واشاعت کی غرض سے کیا تھا۔ مئی ۱۹۹۹ء میں اکادمی کی تشکیلِ جدید کے بعد اِس بنیادی مقصد کی طرف ترجیحی توجہ کی گئی اور اکادمی نے پورے صوبے سے شعرا وادبا کے انتخابات وتذکرے تیّار کرانے کا جامع منصوبہ بنایا۔ جناب شاہد عزیز کی پیشِ نظر کتاب ''تذکرہ شعرائے اودے پور'' اسی منصوبے کے تحت شائع کی جارہی ہے۔ اس کام میں کچھ خامیوں کا رہ جانا ممکن ہے لیکن خلوصِ نیّت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے اور خلوص قائم رہے تو غلطیوں کا ازالہ بھی ممکن ہے۔

میں اپنے تمام کرم فرما اور معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امّید کرتا ہوں کہ وہ اکادمی کے کاموں میں مجھے اسی طرح تعاون دیتے رہیں گے۔

معظّم علی

سکریٹری، راجستھان اردو اکادمی

جے پور

پیش گفتار

"تذکرۂ شعرائے اُودے پور" کو اکادمی کے رُکن جناب شاہدؔ عزیز صاحب نے بڑی عرق ریزی سے مرتّب کیا ہے۔ اس میں ۲۹ شعرا کا مختصر حال اور کلام شامل ہے۔ ان شعرا کا کلام جمع کرنا اور مرتّب کرنا نہایت جانفشانی کا کام رہا ہے جس کے لئے شاہد عزیز صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ شعرا کی پیشکش میں تقدیم و تاخیر کا کوئی معیار مد نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ اور نہ حروف تہجّی کے اعتبار سے شعرائے کرام کا اسمائے گرامی دیے گئے ہیں، چونکہ یہ کام عجلت میں کیا گیا ہے اس لئے فروگذاشتیں رہ سکتی ہیں۔ ادب نواز حضرات سے پُر خلوص درخواست ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے مشوروں سے نوازیں۔ تاکہ اس کے دوسرے ایڈیشن میں ان سے استفادہ کیا جائے۔

اُردو اکادمی اپنے مالی وسائل کے محدود ہونے کے باوجود کتابوں کی اشاعت پر خاطر خواہ توجہ دے رہی ہے۔ امیدؔ ہے کہ اُودے پور کے شعرا کا کلام شائع ہونے کے بعد دیگر اضلاع کے شعرا کا کلام بھی منظر عام پر آئے گا۔ کوششیں جاری ہیں، تمام اُردو نواز حضرات سے تعاون کی اپیل کرتے ہوئے خامیوں کا پہلے سے ہی اعتراف کرتے ہوئے اُمیدؔ کرتا ہوں کہ وہ اُردو اکادمی کی ہر طرح امداد فرمائیں گے۔

والسلام

(ڈاکٹر) سیّد مدبّر علی زیدی

چیرمین، راجستھان اُردو اکادمی، جے پور

عرضِ مرتّب

اُودے پور (میواڑ) راجپوتانہ (راجستھان) کی ایک اہم ریاست رہی ہے۔ یہاں کے مہاراناؤں کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ وہ کبھی مغلوں کے ماتحت نہیں رہے۔ ایک طویل مدت تک مہارانا پرتاپ اور اکبر کی فوجوں میں جنگ ہوتی رہی۔ راجستھانی زبان کا ادب ان مہاراناؤں کی ویرگاتھاؤں (بہادری کے کارناموں) سے بھرا پڑا ہے۔ اس خوبصورت شہر کو ایسے ہی جنگجو مہارانا پرتاپ کے والد اُودے سنگھ جی نے ۱۵۵۹ء میں بسایا تھا۔

۱۶۱۵ء میں جب امر سنگھ اوّل اور جہانگیر کے درمیان صلح ہوگئی تو یہاں کی زبان میں فارسی اور اردو زبان کے اثرات نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ یہاں کے راج گھرانوں میں بولی جانی والی زبان کے آداب والقاب میں فارسی کے الفاظ کا خصوصاً استعمال ہونے لگا۔ اور یہاں پر اردو فارسی کے عالم وفاضل آنے لگے۔ تجارتی اور صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ کئی نئے شعبے وجود میں آئے، ان شعبوں میں کام کرنے والے اکثریورپین ہوا کرتے تھے۔ جن کے اہل کاروں میں شمالی ہند سے آئے ہوئے مسلم وغیر مسلم سبھی تھے، جو اردو زبان سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لیے یہ زبان عدالتوں اور دفتروں میں کاروباری زبان کے طور پر کام آنے لگی۔ مگر آہستہ آہستہ یہ زبان اپنی مٹھاس اور خوش اسلوبی کی وجہ سے عوام کے نزدیک تر ہوتی چلی گئی۔ اور اس طرح کے الفاظ وجملے عام طور پر استعمال ہونے لگے: پیشی، حکم، مدّعی، فیصلہ، ساکن، تنقیح، مدّعا، حاکم، بحث، سزا، عدالت، لہٰذا، وکالت، مثال، دربار، محل، قلعہ، دروازہ، شہر کوٹ، دیوانِ عام، محکمہ، فراش خانہ، چھاپہ خانہ، صاحب، حاضر، تجارت، اُجرت، مجرم، تنخواہ، ملزم، ملازم، سزا، نالش، تعطیل، عرضی، تفصیل، فرمان، تعمیل، نقل، تخمینہ، رتبہ، صلح، نقارچی، خزانچی، اصطبل، پائیدان، صفائی، کاروبار، مقدمہ، تعزیراتِ ہند کے تحت، آپ کی رِضامندی ضروری ہے، آپ کا دھیان اس اُور رجوع کرنا چاہتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح اردو

زبان کی وجہ سے اس ریاست کا رابطہ ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے بھی بآسانی ہو گیا۔

۱۸۶۲ء میں مہارانا شمبھو سنگھ کے دورِ حکومت میں اردو زبان خاص و عام میں اس قدر مقبول ہو گئی کہ عوام کو حاکمِ وقت سے اسے سرکاری طور پر اسکولوں میں پڑھائے جانے کی گذارش کرنی پڑی جو سرکار نے مان لی اور اسکولوں میں اس کے درس و تدریس کا معقول انتظام کیا گیا جس کے لیے باہر سے قابل مدرّس طلب کیے گئے۔ اسی زمانے میں عبیداللہ فرحیؔ، عبدالغنی اور امروہہ کے مولوی عبداللطیف یہاں تشریف لائے۔ انھوں نے یہ فرض بخوبی انجام دیا۔ یہ زمانہ صحیح معنوں میں اردو کی تعلیم و ترقی کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ مولوی عبیداللہ فرحتی نے "تحفۂ راجستھان" کے نام سے راجستھان کی تاریخ یہیں لکھی۔ جو بیک وقت اردو ہندی میں شائع ہوئی۔ نجم الغنی نے "بحر الفصاحت" جیسی مشہور کتاب 'اخبار الصنادید' 'کارنامۂ راجپوتان' اور 'تاریخ حیدرآباد' یہیں تحریر کیں۔ اسی طرح مولوی عبدالرحمٰن نے "سرکوبیِ بدعت" "شمس الدین نے "عقائد شمس" اور "شمس الفقہ" سیّد وحید الدین نے "افتخار اللغات" اور منشی حفیظ اللہ حفیظؔ نے "فانوسِ خیال" اور آئینۂ عبرت" کے نام سے دو ناول تحریر کیے۔ کتابوں کی تحریر و اشاعت کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

۱۸۹۳ء میں جاں نثار اختؔر کے والد مضطؔر خیرآبادی وکیلِ ٹونک کی حیثیت سے یہاں قیام پذیر رہے۔ ان کی موجودگی سے یہاں کی ادبی محفلوں میں بڑی رونق رہا کرتی تھی۔ مہارانا سجن سنگھ کے دور میں بہاری لال راضیؔ (جو غالب کے شاگردوں میں سے تھے) سجن سنگھ کے اتالیق کے عہدہ پر فائز رہے۔ انھوں نے مہارانا کو اردو اور ہندی کی تعلیم دی۔ سجن سنگھ اور ان کے بعد مہارانا فتح سنگھ کے زمانے میں بھی اردو کی تعلیم و تدریس کا یہ سلسلہ متواتر ترقی کی راہ پر گامزن رہا۔ مہارانا فتح سنگھ نے فتح ہائی اسکول کی شاندار عمارت کا تعمیری کام کروایا۔ جو اب فتح ہائر سیکنڈری اسکول کے نام سے جانی جاتی ہے۔ جہاں آج بھی اردو کی تعلیم دی جاتی ہے، دیگر اداروں میں کنور پدا اور نمبر دار (آج کا گرونانک ہائر سیکنڈری اسکول) شامل ہیں۔ آج بھی میرا گرلس کالج اور موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی میں

پی، ایچ، ڈی تک اردو کی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ پہلے ان اداروں میں مشاعرے (خصوصاً طرحی) بھی ہوا کرتے تھے۔ اور باقاعدہ اردو جرائد بھی نکالے جاتے تھے، جن میں شعرو شاعری کے علاوہ دیگر مضامین بھی ہوا کرتے تھے۔ انجمن تعلیم الاسلام، جس کی بنیاد ۱۹۰۴ء میں ڈالی گئی تھی اور اسی کے قریب طیبہ اسکول جیسے کچھ غیر سرکاری ادارے بھی ردو کی تعلیم میں کوشاں تھے۔ ان اداروں کے معلموں میں مسیح الدین، قاضی جمیل الدین، مولانا ظہیرالحسن، منشی کمال احمد، سیّد فرحت حسین، فرحتؔ لکھنوی، منشی جان محمد، محمد حسین اخترؔ قادری، منوّر احمد خاں، اور مہارانا بھوپال کالج میں امام الدین رضوی نجم لدین کے نام بطورِ خاص لیے جاسکتے ہیں۔ دیگر کچھ حضرات بھی اردو کی تعلیم کے لیے پیش پیش رہے ہیں۔ جن میں جسٹس پیارے کشن کول، چیف جسٹس طیّب علی، پروفیسر شیام سروپ کل شریشٹھ، مبارک غنی مبارکؔ، محی علی محی، عبدالغفار، عبیداللہ خاں شہید ٹونکی، سراج الدین سراجؔ، شفیع اگوائیؔ، یوسف حسین یوسفؔ، پریم کمار شریواستو، ڈاکٹر حامد حسین حامدؔ، عبدالشکور شہید نازؔ، عبداللطیف کمپاونڈر، رحیم بخش برقؔ، غواص الزّماں، عبداللطیف لطیفؔ، شفیع الزماں، سیّد عرفیؔ، شفیعؔ نمباہیڑوی، اکبر علی اکبرؔ جیسی ہستیاں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ترقیِ اردو ہند کی مقامی شاخ، جس کے صدر اور سکریٹری بالترتیب منوّر احمد خاں اور وکیل نور محمد تھے، نے بھی یہاں پر کئی مشاعروں اور سیمیناروں کا ان دنوں اہتمام کیا۔

۱۹۵۸ء میں راجستھان ساہتیہ اکادمی کی تشکیل وجود میں آئی۔ جس کے صدر پنڈت جناردھن رائے ناگر تھے۔ اس اکادمی نے اردو، ہندی، سنسکرت اور راجستھانی زبانوں کی ترقی کے لیے اچھا کام کیا۔ اس نے اردو کی کئی کتابیں ہندی رسم الخط میں شائع کیں۔ جن میں "راجستھان کے موجودہ اردو شاعر" "قلم کی تلواریں" اور منشی چاند بہاری لال صباؔ کی "صباگر نتھاولی" وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں عابد ادیب کی کوششوں سے اردو رسم الخط میں ایک رسالہ "نخلستان" نکالا گیا جس کے مدیرِ اعلیٰ پریم شنکر شریواستو اور مینجنگ ایڈیٹر خود عابد ادیب تھے۔ یہ رسالہ آج بھی اردو اکادمی جے پور سے نکل رہا ہے۔

'حلقۂ ادب' 'اُپشام' 'ریشنل فورم' 'بزمِ سخن' 'دارالادب' 'مسلم کلب' وغیرہ اداروں کی اردو دوستی بھی قابلِ احترام رہی ہے۔ ریشنل فورم نے اردو میں ایک رسالہ بھی نکالا تھا مگر شاید ایک یا دو شمارے ہی منظر عام پر آئے، حلقۂ ادب، بزمِ سخن اور اُپشام ایسے ادارے رہے ہیں جن کے ذریعے ایک مدّت تک ادبی نشستیں سیمینار اور مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔ "حلقۂ ادب" کے سکریٹری عابد ادیب "بزمِ سخن" کے مشتاق احمد چنچلؔ اور "اُپشام" کے، آر، زیڈ عثمان جیسے ادیب وشاعر رہے ہیں۔ جن کے ہونے سے آج بھی اودے پور میں ایک ادبی ماحول بنا ہوا ہے۔

"اُپشام" یہاں کے اردو اور ہندی شعرا کی مشترکہ طور پر بنائی گئی ایک بزم تھی۔ جس کے صدر پیار چند ساتھیؔ اور اراکین میں کیلاش جوشی جیسے ہندی کے جدید شعرا شامل تھے۔ اردو کے شعرا میں شاہد عزیز، مشکور جاوید، آر، زیڈ، عثمان اور حفیظ الایمان وغیرہ تھے۔ مشکور جاوید اسی بزم کے سکریٹری تھے اور ان کی کوششوں سے ۱۹۷۵ء میں جدید شعرا کا ایک مشاعرہ سوچنا کیندر میں منعقد ہوا تھا، جس میں مخمور سعیدی ، محمد علوی، ندؔا فاضلی، شین، کاف، نظام اور جدید نثری نظموں کے شاعر حمید سہروردی نے شرکت فرمائی تھی۔ ۱۹۸۴ء میں جب آر، زیڈ، عثمان اُپشام کے سکریٹری تھے ایک جشن "ایک شام شاہد عزیز کے نام" منایا گیا تھا۔ جس میں اردو کے ادبا و شعرا کے علاوہ ہندی کے کچھ مشہور شعرا میں سے نند چترویدی، پرکاش آتور، منگل سکسینہ، گوپال ویاس وغیرہ نے شرکت فرمائی تھی۔ اس جشن کی صدارت پرکاش آتور اور نظامت شین، کاف، نظام نے کی تھی۔ شین کاف نظام نے شاہد عزیز کی شاعری پر ایک مضمون پڑھا تھا جو اُن کی شاعری پر پہلا مضمون تھا۔ اس جشن کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ اس میں شاہد عزیز کی نظموں اور غزلوں پر تصویریں بنائی گئی تھیں۔ مصوری اور شاعری کو ملا کر آرٹ گیلری میں جو تصویریں سجائی گئی تھیں ان کو ناظرین نے بہت پسند فرمایا تھا۔ یہ نیا تجربہ آر، زیڈ عثمان نے اپنی بزم "ٹیم" کی طرف سے کیا تھا۔

اودے پور میں اردو کا کوئی پریس نہیں ہونے کی وجہ سے یہاں کے

مصنفین اپنی کتابیں ہندی رسم الخط میں چھپواتے رہے ہیں۔ مگر کچھ ادیبوں نے اردو میں اپنا کلام باہر چھپوایا ہے۔ ایسی پہلی کوشش نجم الغنی نے کی تھی اور اپنی کتابیں باہر سے چھپوانے میں کامیاب رہے تھے۔ آج بھی کچھ ادیب وشاعر اپنی کتابیں باہر سے چھپوانے کے کوشاں ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا محمد حسین اختر کا کلام بعنوان ''تجلّیات'' مظر عام پر آیا ہے۔ اسی سال ۱۹۹۹ء میں عبد الغفار صاحب کی کتاب ''اسلامی تاریخ کا اجمالی جائزہ'' شائع ہوئی ہے۔ جواُن کے انتقال کے بعد شائع ہوئی ہے، اس کا افسوس ہے۔ صالح محمد نائب کی ''دودل درد بھرے'' اور جمیل قریشی کی ''زخم نیم شب'' (جسے اودے پور کے مشہور شاعر اقبال ساگر نے ترتیب دیا تھا) شائع ہوئی ہیں۔ ارشد عبد الحمید ٹونک سے ماہنامہ ''انتخاب'' نکالا کرتے تھے اور جب وہ اودے پور میں تھے تو انھوں نے شاہد عزیز کے تعاون سے اس کا مشترکہ شمارہ مئی، جون اور جولائی ۱۹۹۲ء یہاں سے نکالا۔ اس شمارے میں اودے پور کے پانچ شاعروں کی غزلوں پر ایک مضمون ہے جو یہاں کے جدید شاعروں پر پہلی بار لکھا گیا۔ یہ شعرا ہیں : شاہد عزیز، خلیل تنویر، عابد ادیب، جمیل قریشی اور پریم بھنڈاری۔

۱۹۹۰ء میں پریم بھنڈاری کی غزلوں کا مجموعہ ''جھیل کنارے تنہا چاند'' مظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ کی ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس کتاب کے بعد ڈاکٹر گر جاویاس کی غزلوں کا مجموعہ ''سیپ سمندر موتی'' شائع ہوا۔ اس مجموعہ پر اردو کے نامور محقق اور انجمن ترقیِ اردو ہند کے جنرل سکریٹری خلیق انجم نے ماہنامہ ''آج کل'' دہلی میں ایک مضمون لکھا۔ جسے پڑھ کر مجھے لگا کہ انھوں نے تحقیق کی جائے تحسین سے زیادہ کام لیا ہے۔ پریم بھنڈاری اور گر جاویاس کی کتابوں میں ایک بات مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے کہ یہ دونوں کتابیں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی رسم الخط میں بھی چھپیں۔ اور یہ بھی کہ یہ دونوں رسم الخط ایک ہی کتاب میں شامل ہیں۔

اودے پور دار السلطنت میواڑ رہا ہے۔ اس لیے پوری ریاست کے زیادہ تر کام یہیں پر ہوا کرتے تھے اس لیے باہر کے آنے والوں کا ایک سلسلہ بنا رہتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں چلنے والی تحریکِ آزادی کا اثر یہاں بھی نمایاں طور پر

پڑا۔ اس تحریک سے وابستہ لوگوں میں خلیل تنویر کے والد منوّر احمد خاں اور راقم الحروف کے والد جناب عبد الرزّاق خاں شفق پیش پیش تھے۔ ۱۹۴۸ء میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور منوّر احمد صاحب نے انجمن تعلیم الاسلام میں بحیثیت مدرّس ملازمت اختیار کرلی۔ اپنی ملازمت سے مستعفی ہو کر بہت ضعیفی کے عالم میں ۳۰ / ستمبر ۱۹۹۹ء کو ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد جو لوگ ترقی پسند تحریک سے منسلک رہے، ان میں عبد الغفار، عبد اللطیف لطیفؔ، محی علی محی، لطیف الزّماں، محمد حسین اخترؔ، محمد حسین صغیرؔ، شفیق الدین شارقؔ، سعادت علی انجمؔ، بلند اخترؔ، صالح محمد نائبؔ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ شفیق الدین شارقؔ کا کلام "نگار" اور "آج کل" جیسے معیاری رسالوں میں اشاعت پذیر رہا ہے۔ لطیف الزّماں نے رشید احمد صدیقی کے مضامین کو ترتیب دینے کا بڑا اہم کام کیا ہے۔ لطیف الزماں اور شفیق الدین شارق، تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا کراچی میں شفیق الدین شارقؔ کا ستمبر ۱۹۹۹ء میں انتقال ہو گیا۔

عوام میں اردو کی مقبولیت کا ایک ذریعہ مشاعرے بھی رہے ہیں۔ صاحبزادہ محمد سعید اور نجم الدین کے زمانے میں بھی مہارانا بھوپال کالج میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ یہ مشاعرے ادبی اداروں کے علاوہ یہاں کے کامیاب تجارتی شعبوں کے ذریعے بھی منعقد ہوتے رہے ہیں۔ جس میں ہندوستاں زنک اور چوفلہ کمپنی پیش پیش رہے ہیں۔ ان مشاعروں میں شرکت کرنے والوں میں جاں نثار اخترؔ، سردار جعفری، مجروحؔ سلطان پوری، کیفیؔ اعظمی، جگن ناتھ آزادؔ، کیفؔ بھوپالی، روشؔ صدیقی، خمارؔ بارہ بنکوی، بیکلؔ اتساہی، رفعت سروشؔ، زبیر رضویؔ، محمد علویؔ، ندا فاضلی، مخمورؔ سعیدی، شین، کاف نظام، رشید افروزؔ، جاوید ناصر، افتخار امامؔ، خاطرؔ حافظی، خداداد مونسؔ، ممتاز شکیبؔ، ظفرؔ غوری، ممتاز راشدؔ، جینت پرمار، زاہدہ زیدی، داراب بانو وفا، فہمیدہ ریاضؔ، ملکہ نسیمؔ وغیرہ اور بھی بہت سے شعرا ہیں۔

مشاعروں کے ساتھ ہی یہاں پر بہت سنجیدہ طور پر سیمینار بھی ہوتے رہے ہیں۔ ان سیمیناروں میں گوپی چند نارنگؔ شمیم حنفی، وارث علوی، قمرؔ رئیس، کالی

داس گپتا رضاؔ، خواجہ احمد فاروقی، شین کاف نظاؔم، اپندر ناتھ اشکؔ، سریندر پرکاش، عصمت چغتائی اور بہت سے ناقدین آچکے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں انجمن ترقی اُردو ہند اور راجستھان ساہتیہ اکادمی اودے پور کے اشتراک سے ایک سہ روزہ سیمینار منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں ماہنامہ ''شاعر'' کے مدیرِ اعلیٰ اعجاز صدیقی خاص طور پر بلائے گئے تھے۔ اس سیمینار میں راجستھان اور راجستھان کے باہر کے تقریباً ۶۰ / ۷۰ سے زیادہ شاعر ،ادیب اور ناقدین نے شرکت کی تھی۔ سیمینار کی آخری شب کو ایک کل ہند مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا تھا جس کی صدارت اعجاز صدیقی صاحب نے کی تھی، اور نظامت کے فرائض ندؔا فاضلی نے انجام دیے تھے۔ اس مشاعرے میں ندؔا فاضلی، شہاب جعفری، نریش کمار شاؔد، شفاؔ گوالیاری، پہلی بار اودے پور آئے تھے۔ راجستھان سے ساحؔل ٹونکی ،حاؔمد رشید، فضل المتین اور دوسرے کئی حضرات شامل تھے۔ ندؔا فاضلی نے بہت ہی خو بصورت انداز میں اس مشاعرے کی نظامت کی تھی۔ اس مشاعرے کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ ندؔا فاضلی نے اس سیمینار اور مشاعرے پر ایک بہت ہی خوب صورت رپور تاژ بمبئی سے اودے پور تک کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ رپور تاژ اسی سال اپریل ۱۹۶۶ء کے ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی میں شائع ہوا تھا۔ اسی شمارے میں راقم الحروف کی پہلی نظم بعنوان شاعر شائع ہوئی تھی۔ اس رپور تاژ کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی اور اودے پور کا نام بھی ادبی منظر نامہ پر دکھائی دینے لگا۔ یہاں کے ادبی ماحول کو بنائے رکھنے میں باہر سے آنے والے ادیب و شاعر کی بھی بڑی اہمیت رہی ہے۔

۱۹۶۲ء میں کیفؔ بھوپالی پہلی بار اودے پور آئے اور ایک لمبے عرصے تک یہیں رہے۔ اس کے بعد تو اکثر یہاں آتے رہے۔ یہ سلسلہ ۷۰ / ۸۰ تک یوں ہی چلتا رہا۔ وہ جب بھی آتے دو تین مہینے تک یہیں قیام کرتے۔ کیفؔ صاحب بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے رہنے سہنے کا ڈھنگ اور ان کا اندازِ گفتگو ایسا تھا کہ وہ سب کو اپنی اور متوجہ کیے رہتے تھے۔ ایک جمگھٹ ہر وقت ان کے پاس لگا رہتا تھا۔ ان کی غزلوں کے شعر آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔ دیگر حضرات میں نشاط ٹونکی، ثاقب حسین رضوی، جمیل قریشی،

ارشد عبدالحمید، کامران نجمی، خاطر حافظی، ریاست حسین فاروقی، ہماامل نیری (جو اب اودے پور میں ہی سکونت پذیر ہیں) ان حضرات میں زیادہ تر ایسے ہیں جنھوں نے اپنی عمر کے ۵ / سے ۳۰ تک سال یہیں گذارے ہیں۔ جمیل قریشی اور ارشد عبدالحمید نے تو اپنی اب تک کی تخلیقات کا بڑا حصہ یہیں رہ کر تخلیق کیا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد وہ اتنا اچھا نہیں لکھ پائے جتنا کچھ یہاں لکھ رہے تھے۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان جدید رجحان کے زیر اثر کچھ نئے شاعر وادیب ادبی منظر نامہ پر ابھر کر سامنے آئے۔ ۶۰ سے ۸۰ء تک کے درمیانی عرصہ میں ان لوگوں کی تخلیقات ہندوپاک کے ان رسالوں میں چھپنے لگیں، جن کا شمار صفحہ اوّل کے رسالوں میں ہوتا ہے۔ اس دور میں جو ادیب وشاعر ابھر کر سامنے آئے ان میں عابد ادیب، خلیل تنویر ، شاہد عزیز، حفیظ الایمان، مشکور جاوید، آر، زیڈ عثمان، پریم بھنڈاری شامل ہیں۔ باہر سے آنے والوں میں ۸۰۔۹۰ کے درمیان جمیل قریشی، ارشد عبدالحمید کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ کچھ ایسے شاعر بھی ہیں جن کا رابطہ رسالوں سے تو نہیں رہا مگر وہ شعر کہتے رہے۔ اور یہاں کی ادبی محفلوں سے منسلک رہے۔ ان میں اقبال ساگر، مشتاق چنچل، اسحاق محمد فرقت، محمد حسین صفیر، روشن لال چوفلہ، محمد حسین ہما، شبیر رضا، مجروح، محمد ابراہیم برق (مرحوم) محمد حسین مسافر (مرحوم) احمد علی کشور (مرحوم) محمد حسین اختر (مرحوم) اقبال حسین اقبال، گرجا دیاس، عذرا نور اور آمنہ شاد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اس کتاب کو ترتیب دیتے وقت مجھے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں ان شعرا کو بھی اس کتاب میں شامل کرلوں جن کا تعلق اودے پور سے تو نہیں ہے مگر اودے پور کی ادبی فضاؤں سے ضرور ہے۔

ڈونگر پور میں اردو تدریس وتعلیم کا کام ہوتا رہا ہے۔ مگر ۱۹۶۰ء کے آس پاس مولوی اکبر صاحب کے ڈونگر پور آجانے سے اردو تعلیم کا کام بڑے پیمانے پر ہوا، اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے بھی ابھر کر سامنے آئے ۱۹۷۳ء میں خلیل تنویر

اُودے پور سے تبادلہ ہو کر ڈونگر چلے گئے اور وہاں ۱۹۷۷ء تک رہے۔ ان کے وہاں رہنے سے ادبی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ لوگوں کا خیال جدید اردو ادب کی طرف مائل ہو گیا اور اردو کے کئی رسالے یہاں آنے لگے۔ جن میں ''شبخون'' کا اہم رول رہا۔ جدید رجحانات سے تعلق رکھنے والوں نے ایک بزم ''بزم ادب'' کے نام سے تشکیل دی۔ اس بزم نے ۱۹۷۵ء میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جس میں راجستھان کے نئے لکھنے والے شریک تھے اس مشاعرے کے بعد یہاں کے نئے لکھنے والوں نے لکھنے پڑھنے میں بڑی دلچسپی لی اور کچھ نئے ادیب و شاعر ابھر کر سامنے آئے۔ جن میں اقبال انجمؔ، معصوم نظرؔ، اسماعیل نثارؔ، مقبول رضاؔ، جگجیت سنگھ نشاطؔ اور آنند قریشی مرحوم کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اقبال انجم اور معصوم نظرؔ کا کلام اکثر و بیشتر ہندوپاک کے رسائل میں نظر آنے لگا۔

بانسواڑہ میں ادبی ماحول بنانے میں جن لوگوں کا بہت ہی اہم رول رہا ہے ان میں مضطر صدیقی، شاہد میرؔ، بسملؔ نقشبندی اور پریم سوشیل دردؔ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

۱۹۷۴ء کے آس پاس ظفرؔ غوری (مرحوم) بانسواڑہ آئے۔ ان کے یہاں آنے سے جدید شاعری کا ایک ماحول بنا اور شاہد میرؔ کے ساتھ مل کر ایک ادبی بزم ''بزم ادب'' کے نام سے بنائی۔ جو ہر ماہ نشستوں کا انتظام کرتی تھی اور سال میں ایک مرتبہ 'کل ہند مشاعرہ' ضرور کرواتی تھی۔ یہاں کی ادبی فضاؤں میں شاہد میرؔ کے دھنک آمیز رنگ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ شاہد میر کی کوششوں سے یہاں کے نمایاں شاعروں کا تخلیقی انتخاب بزم ادب کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا۔ جسے ''ہفت رنگ'' کے نام سے خود شاہد میرؔ نے ترتیب دیا۔ اس انتخاب کے بارے میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ''غزلوں اور نظموں کے اس مطالعے کے بعد مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ اس علاقے میں جہاں اردو کا کوئی خاص تعلق نہیں رہا ہے نہایت مختصر مدّت میں شاعری کا اتنا اچھا ذوق پیدا ہو گیا ہے۔ مطالعہ کے دوران مجھے بعض اشعار نے روکا اور دوبارہ پڑھنے پر مجبور کیا ہے اور اس بات کا احساس دلایا ہے کہ ادب کسی خاص علاقہ یا فرقہ کے لیے مخصوص نہیں ہوتا''۔

بانسواڑہ کے نمائندہ شعرا میں شاہد میرؔ (جواب سرونج میں قیام پذیر ہیں) بسملؔ نقشبندی، سید روشن اور پریم سوشیل دردؔ کے نام لیے جاسکتے ہیں مگر بہت جلد ہی ظہیر آتشؔ، نعیم اخترؔ، راجندر رازؔ، سعید منظرؔ، جمنا پرشاد سازؔ، اشتیاق ساحلؔ، عبدالکریم کریمؔ اور گھنشیام داس نورؔ بھی اپنی ادبی شناخت منوالیں گے۔

نماہیڑہ میں اردو کی تعلیم کا کام مدرسوں میں دینی تعلیم کے ساتھ ہوتا رہا ہے، جس کی اہمیت کوئی خاص نہیں رہی مگر میکشؔ اجمیری کے یہاں آنے سے اردو تعلیم کا کام یہاں ہوا ہے۔ ان کی کوششوں سے اب یہاں کے اسکولوں میں تیسری زبان کے طور پر اردو پڑھانے کا کام ہونے لگا ہے۔ میکشؔ اجمیری کی وجہ سے بھی یہاں کچھ ادبی ماحول بنا ہے۔ انھوں نے ہی یہاں ''علمی سنگم'' اور ''بانی بزمِ ساغر'' کے نام سے ادبی بزمیں بنائیں۔ ان دونوں بزموں کے زیر اہتمام انھوں نے کئی 'کل ہند مشاعرے' منعقد کیے جس کی وجہ سے یہاں کچھ ادبی ماحول بنا مگر ادبی دنیا سے ان کا رابطہ نہیں کے برابر ہونے سے یہاں ایسا کچھ ماحول نظر نہیں آتا جیسا کہ اودے پور، ڈونگر پور یا بانسواڑہ میں ہے۔ پھر بھی میکشؔ اجمیری کی شخصیت کی وجہ سے یہاں پر کچھ لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوگیا ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ لوگ کوئی کارنامہ انجام دے سکیں۔ جن لوگوں نے یہ شوق پال لیا ہے ان میں ناظمؔ سعیدی، عبدالحکیم فرقؔ، محمد شاہ نازؔ، اعجاز احمد اعجازؔ، کنہیا میکشؔ، فیض محمد فیضؔ، وسیم عرفان، محمد یوسف چراغؔ، کنہیا لال کنہیا اور امین خاں مائلؔ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہاں پر جو بھی ادبی ماحول ہے وہ میکشؔ اجمیری کے دم خم سے ہے۔

کتاب کو ترتیب دیتے وقت میں نے اس بات کا پورا دھیان رکھا ہے کہ کوئی بات مجھ سے چھوٹ نہ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی شاعر یا ادیب کا ذکر رہ جائے جہاں تک میری کوشش تھی میں نے تمام شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کا منتخب کلام بھی نمونے کے طور پر پیش کیا ہے پھر بھی بہت ممکن ہے کہ کوئی بات یا کسی شاعر کا ذکر میری لاعلمی کی وجہ سے میری تحریر میں نہ آسکا ہو۔ ان تمام باتوں کے لیے میں اپنی آئندہ نسلوں سے امید کر

تا ہوں کہ وہ میری لا علمی کو نظر انداز کرتے ہوئے ان تمام باتوں کا ذکر ضرور کریں جو میری لا علمی کی وجہ سے اس کتاب میں نہ آسکیں۔ اودے پور، ڈونگر پور، بانسواڑہ اور سبھا ہیڑے کے ان شاعروں سے معذرت خواہ ہوں جن کا ذکر تو میں نے اپنے پیش لفظ میں کیا مگر نمونے کے طور پر ان کا کلام پیش نہیں کر سکا۔ کیونکہ میری تمام کوششوں کے باوجود بھی میں ان کا کلام حاصل کرنے سے قاصر رہا۔ میں خلیل تنویر، صالح محمد نائب، محمد حسین صفیر کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اس مضمون کے لیے مواد کی فراہمی میں میری مدد کی۔ ساتھ ہی ساتھ تعاون کے لیے میں شبیر رضا کا بھی شکر گذار ہوں۔ میں نے اس کتاب میں ان شعرا کو شامل کیا ہے جو بقید حیات ہیں مگر کلام کے انتخاب میں میں نے یہ گنجائش رکھی ہے کہ ان شعرا کی نمائندگی ٹھیک سے ہو جن کا تعلق ادب سے بہت گہرا ہے، جو ادب میں اپنی ایک پہچان بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔

میں راجستھان اردو اکادمی کی موجودہ کمیٹی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اس بار اودے پور کی ادبی خدمات کی طرف توجہ کی۔ میں اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر مدبّر علی زیدی اور سیکریٹری جناب معظم علی کا بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اس طرف توجہ فرمائی اور ایک کمی کو پورا کرنے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

شاہد عزیز

عابد ادیب

نام عابد حسین، ادبی نام عابد ادیب اور والد کا نام جناب حسن علی۔ ۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو اودے پور میں پیدا ہوئے۔ عابد ادیب ایک عرصہ تک عابد حسین ادیب کے نام سے شعر گوئی کرتے رہے ۔ مگر ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت سے متاثر ہو کر جدید شاعری کرنے لگے۔ اور اپنا نام عابد حسین ادیب سے بدل کر عابد ادیب لکھنے لگے۔ ایف، اے، تک تعلیم حاصل کر کے اپنے والد اور خاندان کے دیگر حضرات کے ساتھ تجارت سے منسلک رہے۔ مگر عابد ادیب کے اندر جو شاعر تھا اسے یہ کاروباری زندگی پسند نہیں آئی۔ عابد ادیب نے شاید اپنے شاعر کی بات مان کر ملازمت اختیار کر لی۔ راجستھان ساہتیہ اکادمی میں دوران ملازمت مطالعہ اور شاعری دونوں چلتے رہے۔ عابد ادیب اردو، فارسی، عربی اور ہندی کے اچھے جانکار ہیں۔ اس لیے اکادمی سے نکلنے والی کتابوں میں ان کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ عابد ادیب کی کوششوں سے ہی ''نخلستان'' اردو رسم الخط میں جاری ہوا، جس کے مینیجنگ ایڈیٹر خود عابد ادیب تھے۔ یہ رسالہ آج بھی اردو اکادمی جے پور سے جاری ہے۔

عابد ادیب ۱۹۵۲ء سے شعر کہہ رہے ہیں اپنے ابتدائی دور میں یہ اپنا کلام محمد حسین اختؔر قادری کو دکھاتے رہے، مگر جلد ہی وہ خود عروض کے ماہر ہو گئے اور اپنی غزلوں کی بحر و وزن خود ہی ٹھیک کرنے لگے۔ عابد ادیب اپنے ابتدائی دور میں ترقی پسند تحریک کے ہموار ہے۔ فیض احمد فیضؔ، اختر شیرانی اور الطاف مشہدی سے بڑے متاثر رہے۔ ان کی نظموں میں الطاف مشہدی اور غزلوں میں اختؔر شیرانی کا رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں کیفؔ بھوپالی کی آمد کا اثر بھی ان کی غزلوں میں دکھائی دیتا ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد ہندوستان کے کئی شاعر و ادیب جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے جدیدیت کے زیرِ اثر جدید شاعری کرنے لگے۔ عابد ادیب بھی اپنے آپ کو اس اثر سے نہیں بچا سکے۔ اور اب وہ ناصر کاظمی، شکیب جلالی اور محمد علوی کو پسند کرنے لگے اور غزل میں اس طرح کے شعر سامنے آنے لگے:

کچھ اس طرح سے بھیڑ میرے چاروں اور ہے
جیسے سڑک کے بیچ کوئی حادثہ ہوں میں

پھروں یہ سوچتا ہوں کنارے کھڑا ہوا
ہوتا جو میں پَوَن تو سمندر کو لانگھتا

اب عابد ادیبؔ کی غزلیں ہندوپاک کے معیاری رسالوں میں متواتر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ عابد ادیب کا کوئی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ہے مگر امید کی جاسکتی ہے کہ وہ جلد ہی اپنے کلام کا انتخاب منظر عام پر لے آئیں گے۔

غزلیں

اب راستہ ہی ڈھونڈیے اپنے بچاؤ کا
دریا چڑھا ہے تیز ہے دھارا بہاؤ کا

آئے ہیں صاف صاف نظر دوستوں کے گُن
جب جب بھی کھل گیا ہے بھرم رکھ رکھاؤ کا

اس جیسا باشعور نہیں پورے شہر میں
جس آدمی کو کہتے ہو ضدی سبھاؤ کا

پتھراؤ ہو رہا ہے صداؤں کے شہر میں
احساس ہو رہا ہے رگوں میں تناؤ کا

یلغار پانیوں کی نہیں رخ ہوا کا تھا
انجام اپنی آنکھ سے دیکھا ہے ناؤ کا

صحرائے زندگی میں جوانی کا کارواں
پاتا نہیں مقام کہیں بھی پڑاؤ کا

○

سفر میں ایسے کئی مرحلے بھی آتے ہیں
ہر ایک موڑ پہ کچھ لوگ چھوٹ جاتے ہیں

یہ جان کر بھی کہ پتھر ہر ایک ہاتھ میں ہے
جیالے لوگ ہیں شیشوں کے گھر بناتے ہیں

جو رہنے والے ہیں لوگ ان کو گھر نہیں دیتے
جو رہنے والا نہیں اس کے گھر بناتے ہیں

جنھیں یہ فکر نہیں سر رہے رہے نہ رہے
وہ سچ ہی کہتے ہیں جب بولنے پہ آتے ہیں

کبھی جو بات کہی تھی ترے تعلق سے
اب اس کے بھی کئی مطلب نکالے جاتے ہیں

○

ہماری بزم میں اک روز آکے دیکھ ذرا
چراغ دل کے لہو سے جلا کے دیکھ ذرا

صلیبِ وقت پہ لٹکے ہیں ان گنت شہکار
تو دیدہ ور ہے تو نظریں اٹھا کے دیکھ ذرا

تو، اجنبی بھی نہیں، بے وفا نہیں نہ سہی
نہیں ہے غیر تو مجھ میں سما کے دیکھ ذرا

یہ ہم بھی دیکھیں گے ہمدرد کون ملتا ہے
تو، اس شہر میں صدائیں لگا کے دیکھ ذرا

میں تیری راہ کا پتھر نہیں کوئی اے دوست
جو دیکھنا ہو تو ٹھوکر لگا کے دیکھ ذرا

○

جو صبح ہوتے ہی سورج کی مثل جلتا ہے
وہ ذہن رات کی تاریکیوں میں پلتا ہے

یہاں امید نہ باندھو کہ ٹھیس پہنچے گی
یہ آدمی ہے ہواؤں کے رُخ پہ چلتا ہے

سمندروں پہ جسے اختیار تھا کل تک
کھڑا ہوا لبِ دریا وہ ہاتھ ملتا ہے

یہ دل کہ نور کی کرنیں بکھیرتا ہے، مگر
ہر اک چراغ یہاں آنسوؤں سے جلتا ہے

کوئی چبھن بھی نہیں ہوتی ختم اب دل سے
نہ اب تو سر سے کوئی بوجھ غم کا ٹلتا ہے

جہاں سے گذرا ہے کہ، برسا ہے ٹوٹ کر عابدؔ
وہ اپنے ساتھ گھٹاؤں کو لے کے چلتا ہے

اندیشہ

روشنی کا سفیر نوربکف
رات کے اُن سیہ خانوں میں
اس طرح چھا گیا ہے ہر جانب
جیسے ہم سب گنہ گاروں کا
ہر گنہ بے نقاب کر دے گا

شام

ان مخروطی چٹانوں پر
کچھ لمحوں کچھ گھڑیوں پہلے
اک بلہ بد مست الہڑ دوشیزہ
اپنے کپڑے کھول رہی تھی
زیرِ لب کچھ بول رہی تھی
اور یہ مخروطی چٹانیں
بے حس اور مبہوت کھڑی تھیں

زندگی

زندگی، ادھ کھلے غنچہ کی طرح
نامکمل ہے ابھی
یعنی اس پیکرِ تصویر کے خاکوں میں مجھے
اپنی معصوم تمنا کا لہو بھرنا ہے
عمر کو اور ابھی صرفِ الم کرنا ہے

تلخ نوائی

کوئی شکوہ بھی نہیں، تجھ سے شکایت بھی نہیں
یہ تو ہر دور میں ہوتا ہی چلا آیا ہے
کون کس کے لیے مرتا ہے ستم سہتا ہے
تیرے نغموں تیرے گیتوں کی قسم
تیرے ٹوٹے ہوئے وعدوں کی قسم

....

لیکن ایام در ایام مہ وسال کے بعد
آج بھی جب تیری باتوں کا خیال آتا ہے
ذہن جلتا ہے، خلش درد کی بڑھ جاتی ہے
زہر ہی زہر سا احساس میں گھل جاتا ہے
بیچ بازار میں لٹنے کا گماں ہوتا ہے
ڈھونڈتا ہوں کہ مری زندہ دلی مل جائے
مانگتا ہوں کہ مجھے میرا لڑکپن دے دو
لیکن ہر خواب کی تکمیل کہاں ہوتی ہے

○

میری محبوب! میری روح کی تابندہ کرن
تیری جانب سے طبیعت مری بدظن بھی نہیں
جانتا ہوں کہ یہی وقت کی سب باتیں ہیں
وقت کا سارا زمانہ ہے، خدائی ساری
اور تو وقت کی آغوش کی پروردہ ہے

....

پھر اگر مجھ سے تو، پھر جائے تو حیرت کیا ہے
تو، نگاہوں کو بدل دے تو تعجّب کیا ہے
جانتا ہوں کہ یہ سب وقت کے ساتھ ہوتا ہے
کوئی شکوہ بھی نہیں، تجھ سے شکایت بھی نہیں
یہ تو ہر دور میں ہوتا ہی چلا آیا ہے
کون کس کے لیے مرتا ہے، ستم سہتا ہے

خلیلؔ تنویر

نام خلیل احمد خاں، ر تنویر احمد خاں، والد کا نام ماسٹر منوّر احمد خاں۔ خلیل تنویر کے گھر والوں نے خلیل تنویر کے دو نام رکھے۔ خلیل تنویر نے دونوں ناموں کو ملا کر ایک ادبی نام خلیل تنویر بنالیا۔ اب یہی نام ادبی دنیامیں ان کی پہچان بن گیا۔

خلیل تنویر ۱۸ر جنوری ۱۹۴۴ء کو اودے پور ہی میں پیدا ہوئے۔ یہیں مہارانا بھوپال کالج سے بی، اے کیا اور گورنمنٹ میوزیم اودے پور میں سُپر وائزر کے عہدے پر ملازمت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ دورانِ ملازمت تاریخ میں ایم، اے کیا اور اپنے شعبہ میں ترقی کرتے ہوئے آج کیوریٹر کے اعلیٰ عہدے پر اپنی ملازمت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ شعر کہنا ۱۹۶۰ء میں ہی شروع کر دیا تھا۔ اپنے ابتدائی دور میں ترقی پسند تحریک زیرِ اثر رہے۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ترقی پسندانہ انداز میں کئی نظمیں کہیں۔ ایک نظم یوں شروع ہوتی ہے ؎

چین دُہراتا ہے تاریخ کے خونی نغمے

پہلی غزل ''زنجیر'' بھوپال میں شائع ہوئی۔ اپنی شاعری کی نوک پلک ٹھیک

کرنے کے لیے کسی کو استاد نہیں بنایا۔ کالج کے زمانے میں ترقی پسند شعرا کے ساتھ انھوں نے یوسف ظفر، میراجی، ن، م، راشد اور خلیل الرحمٰن اعظمی کا مطالعہ کیا تو وہ نئے رجحانات کی طرف مائل ہو گئے۔ مگر ۱۹۶۲ء میں جب کیفؔ بھوپالی روپوش تھے تو کافی عرصہ تک اودے پور میں رہے اس دوران کبھی کبھی (خود خلیل تنویر کی زبانی) وہ کیفؔ صاحب کو اپنی چیزیں دکھاتے رہے اور انھوں نے خلیل تنویر کی حوصلہ افزائی کی۔

۱۹۶۶ء کے بعد جدید شاعری کے اثرات ان پر اس قدر حاوی ہوئے کہ جدید شاعری کرنے لگے اور اسی سال ''شبخون'' منظر عام پر آیا۔ جس نے نئے لکھنے والوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ خلیل تنویر کی زیادہ تر چیزیں ''شبخون'' میں ہی اشاعت پذیر رہیں۔ خلیل تنویر نظم کے شاعر ہیں مگر وہ غزل کے شاعر کی حیثیت سے ہندوپاک کے کئی شعری انتخابات میں شامل ہیں۔

کوٹہ سے عقیل احمد شادابؔ نے راجستھان کے لکھنے والوں کا ایک شعری انتخاب ''سرابوں کے سفیر'' کے نام سے شائع کیا تھا، جس میں خلیلؔ تنویر کی نظموں کے ساتھ ان کی دو غزلیں بھی شامل تھیں۔ 'سرابوں کے سفیر' میں شامل اشاعت چیزوں پر تبصرہ کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا تھا کہ خلیلؔ تنویر اور شاہدؔ عزیز نے شعوری طور پر نظمیں کہی ہیں اور ان کا معیار دیگر تخلیقات سے بہتر بھی ہے مگر اس کتاب میں شامل تمام چیزیں اس معیار کی نہیں ہیں کہ انھیں کسی شعری انتخاب میں شامل کیا جاسکے۔ مگر اس انتخاب کے بعد تو خلیل تنویر کی کئی غزلیں ہندوپاک کے انتخابات میں شامل ہوتی رہی ہیں۔ جن میں کچھ خاص ہیں ''ترسیل'' (بھاگلپور) ''شہزادہ'' (نئی دہلی) ''سوچ رُت'' (پاک) ''بیاضِ یکتا'' (پاک) ''رنگِ غزل'' (پاک) ''روحِ غزل'' (الہ آباد)۔ کچھ غزلیں ہندی کے انتخاب میں بھی شامل ہیں۔

خلیل تنویر پچھلے چالیس سالوں سے شعر گوئی میں مصروف ہیں مگر اب تک کوئی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ مگر ان دنوں وہ اپنا مجموعہ ترتیب دینے کی کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔

وابستگی

پھر یوں ہوا..................

ذہن کے سمندر میں لہریں اٹھیں

مجھے اپنے جنم کی کہانی سے...........

نفرت سی محسوس ہونے لگی

میں کیوں جل رہا ہوں ؟

کس کے لیے جل رہا ہوں ؟

یہ سفر بوجھ ہے !

چلتے چلتے یوں ہی

راستے کے کسی موڑ پر

کالی آواز حملہ کرے

تو پھر کیوں ؟

لمحہ لمحہ بچانے کی کوشش کروں

لمحہ لمحہ بچانے کی کوشش کروں

خوف جو زندہ ہے

بستیاں......................

اونچی نیچی فصیلوں سے

باہر نکل آئی ہیں مگر

کسی بھی لمحہ، کچھ بھی گذر جانے کا ڈر

ذہن کی گہرائیوں میں اسی طرح زندہ ہے

جیسے سفر کی پہلی رات میں تھا

زمین سے لپٹنے کی خواہش بھی

صرف بچاؤ کی ایک صورت ہے

اور کچھ بھی نہیں

آج بھی

سوچ کے سبھی راستے

اسی کالی خندق تک

جا کر

بجھنے لگتے ہیں

بے قراری کا سبب کون ہے

جدھر بھی دیکھو......

روشنیوں کو گھیرے ہوئے

دھندلاہٹوں کا پردہ ہے

کہاں سے چلے تھے ؟

کدھر جا رہے ہیں ؟

کچھ پتہ نہیں چلتا ؟

صرف اک احساس زندہ ہے

اک سفر ہے

اور بلندیوں کو تیزی سے

پار کرتے چلے جا رہے ہیں

پر کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں

مگر اک عجیب بے قراری ہے

آخر اس بے قراری کا انتظار ہے سبب کون ہے

نظم

آئینوں کا سفر گرد ہے
ایسا کچھ بھی نہیں ہے
جو تم سوچتے ہو
اس خاک کے بدن میں
لہو، آگ، پانی، ہوا
اندھیرے، اجالے
اس طرح جذب ہیں
جن کے پہچاننے کے لیے
آئینوں کا سفر گرد ہے

ایک یاد

مجھے یاد ہے
ڈوبتی شام تھی
میں کالے سمندر کی لہروں میں
بہتا چلا جا رہا تھا
اور کنارے کھڑا کوئی سایہ
آواز دیتا رہا!

عجیب پیاس ہے

ہماری کھیتیاں گھروں میں تھیں
اور ہم بھٹک رہے تھے
اجنبی صداؤں کے سراب میں
وہ کون سی طلب ہے جو
حصارِ جان سے نکل سکی
عدم کے راز پا سکی
نظر زمین کے طلسم میں

اسیر ہے
عجیب پیاس ہے
کہاں کہاں لیے پھری

ماضی ایک عذاب

اس نے شاید ٹھیک کہا تھا
پیچھے مڑ کر دیکھو گے تو
پتھر کے بن جاؤ گے!
لیکن میں نے
پیچھے مڑ کر دیکھ لیا

نظمیں

یہ خاک خاک بدن
جس میں روشنی بھر کر
محبتوں کے درختوں کو سبز کرتا ہے
مگر کیا بھید ہے قدرت کے کارخانے میں
طرح طرح کی حسیں شکل جو بناتا ہے
پلک جھپکنے میں ان کو سمیٹ لیتا ہے
مرے خیال کے ہر بت کو توڑ دیتا ہے

○

عجب رات تھی
احساسِ گم شدہ کی رات
شجر سے لپٹا تھا
لیکن کوئی خیال نہ تھا

○

حیرانی کی بات ہے
وہ لوگ
تبدیلی اور بغاوت کی
باتیں کرتے ہیں
جو کچھ کھونا نہیں چاہتے

گُلِ لاجورد

میں سوچتا رہا
لیکن نہ کوئی بھید کھلا
تیرے وجود کے سائے میں
آگ سی کیوں ہے ؟
یہ کیسا رنگ ہے
مٹی میں جذب ہو کر بھی
سیاہ رات کے آنچل میں جگمگاتا ہے
کہ جیسے چاند ....
سمندر میں ڈوب جاتا ہے

شاہد عزیز

نام عبدالعزیز خاں، ادبی نام شاہد عزیز، والد کا نام عبدالرزاق خاں شفق۔ آبائی وطن رامپور (یوپی) ہے۔ دادا عبدالغفور خاں ۱۸۹۰ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں اودے پور آئے تھے اور پھر یہیں پر سکونت اختیار کر لی تھی۔ والد ریلوے میں ملازم تھے اس لیے ان کا تبادلہ اکثر اودے پور سے باہر بھی ہوتا رہتا تھا۔ جب میں یکم ستمبر ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوا تب وہ اپنی ملازمت کے فرائض چتوڑ میں انجام دے رہے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدِ محترم بھی شاعر تھے اور شفق تخلص کرتے تھے۔ مگر ان کی کوئی تخلیق میری نظر سے نہیں گذری۔ کیونکہ ان کے انتقال کے بعد ان کی تمام تر کتابیں تقسیم ملک کی افرا تفری کے نذر ہو گئیں۔ اس لیے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ شاعری مجھے ورثہ میں ملی مگر بغیر کسی ورثہ کے۔

شاعری کی ابتدا ۱۹۶۴ء میں ہو گئی تھی اور ۱۹۶۶ء سے ہندوپاک کے معیاری رسائل میں کلام متواتر چھپ رہا تھا۔ کچھ کہانیاں بھی لکھیں جو ہندی اور اردو کے متفرق رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر بنیادی طور پر میں شاعر ہی ہوں۔ اس لیے صرف شاعری پر ہی دھیان مرکوز رہا۔ میری نظموں کا ترجمہ ہندی، پنجابی اور انگریزی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے دو کتابیں "نفس در نفس" (غزلوں کا مجموعہ) اور "ساعتوں کا سفر" (نظموں کا مجموعہ) ترتیب دی جا چکی ہیں۔ کوشش میں ہوں کہ یہ جلد ہی منظر عام پر آجائیں۔

پرندے

پرندے جب کبھی
اونچی اڑانوں پر
نکلتے ہیں
مگر سورج کے ڈھلنے تک بھی
جب واپس نہیں آتے
تو پھر یہ شام کے منظر
انھیں آواز دیتے ہیں
درختوں میں ہوائیں
دیر تک بے چین رہتی ہیں
پرندے کیوں نہیں لوٹے!
زمیں جب پوچھتی ہے
آسمانوں سے
تو سورج ڈوب جاتا ہے
اندھیرا پھیل جاتا ہے

تلافی

مجھے فصلیں اگانی ہیں
کہیں بنجر زمینوں پر
مجھے چشمے بہانے ہیں
سلگتے ریگزاروں پر
مجھے کچھ خواب بونے ہیں
تمھاری سونی آنکھوں میں
مجھے سورج اگانے ہیں
کہیں تاریک راہوں میں
مجھے تارے سجانے ہیں
سیاہ بختوں کے خانوں میں
مجھے کچھ لفظ دینے ہیں
ہزاروں بے زبانوں کو
مجھے پہچان دینی ہے
کئی بے نام سایوں کو
مجھے کچھ کام کرنے ہیں
پرانے زخم بھرنے ہیں

موسم

اجڑتی ساعتوں کا
آخری لمحہ بلاتا ہے
موسمو آؤ
میرے ہاتھوں میں
کھل جاؤ
تمہارے راستوں پر
آنکھ پھیلائے ہوئے ہیں
زرد چہرے، بند کمرے
خوف کھائے رتجگے
خونی زہریلی ہوائیں
جسم میں چلتی ہوئی
آہٹوں کی منتظر ہے
اک ندی
جمتی ہوئی بہتی ہوئی
زندگی کی
خشک دھرتی
آج بھی بے چین ہے
موسمو آؤ
میرے ہاتھوں میں کھل جاؤ

جنگ کے بعد

پھر یوں ہوا کہ روشنی دیوار بن گئی
رستے تمام کالے پہاڑوں پہ چڑھ گئے
آواز گھاٹیوں میں کہیں ڈوبنے لگی
میرا وجود مجھ میں سمٹ کر بکھر گیا
وہ جگمگاتا شہر بھی ویران ہو گیا
اک ایک مکان اپنی زمیں سے اکھڑ گیا
پھر جستجو ہے کوئی سمندر ملے کہیں
ساحل پہ جس کے چھوٹا سا میرا مکان ہو

تنہائی

جھیل کے کناروں پر
چاندنی دمکتی ہے
اور یہ حسیں لمحے
جانے کیوں سلگتے ہیں
جس طرف نظر ڈالو
خامشی کے سایے ہیں
ذہن کے دریچوں میں
کوئی مسکراتا ہے
زندگی کے ویرانے
اب کبھی نہ مہکیں گے
پوچھتی ہے تنہائی
کون آنے والا ہے ؟

غزلیں

تمام دشت میں اس نے گھما دیا مجھ کو
جگہ جگہ پہ سمندر دکھا دیا مجھ کو

میں بھاگ نکلا بدن کے حصار سے لیکن
وہ کیسی آگ تھی جس نے جلا دیا مجھ کو

پھر آسمان کو شاید زمین مل جائے
اس انتظار کی حد پر بٹھا دیا مجھ کو

لڑادیا مجھے کالی ہواؤں سے اس نے
گذرتی رات کا سایہ بنادیا مجھ کو

مرے وجود کو دھرتی میں دفن کر کے اب
نہ جانے کون سا پیکر بنادیا مجھ کو

○

نہ جانے کس کو کس کی جستجو ہے
کوئی پرچھائیں اب بھی کوبکو ہے

کبھی دیکھا ہے تونے آئینہ میں
کہ صدیوں بعد بھی تو خوبرو ہے

بہت دن ہوگئے ہیں تھک گیا ہوں
کہیں رک جاؤں اب یہ آرزو ہے

جسے میں کھوچکا تھا تیرگی میں
وہ سایہ آج میرے روبرو ہے

تری خواہش میں سورج ڈوبتا ہے
سحر کو اب بھی تیری جستجو ہے

○

دل سے نکلا ڈر میرا
بھول گیا وہ گھر میرا
اس کی بستی میں ڈھونڈو
وہیں کہیں ہے سر میرا
اب کیسے اڑ سکتا ہوں
جب سے چھوڑ گیا ہے تو
کھلا ہوا ہے در میرا
تجھ سے ہے امید بہت
کام کوئی تو کر میرا

○

اب اتنی حیرانی کیوں
ان آنکھوں میں پانی کیوں
بستی میں اب کوئی نہیں
پھیل گئی ویرانی کیوں
مجھ کو روک نہیں سکتا
دریا ہے طوفانی کیوں
اس کے جیسا کوئی نہیں
ڈھونڈ رہے ہو ثانی کیوں
اک دن سب کو مرنا ہے
روتی ہے دیوانی کیوں

جمیل قریشی

نام جمیل قریشی، پندرہ مئی ۱۹۳۳ء کو شہر باندہ (یوپی
) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۷ء کے آس پاس سے شعر کہہ رہے ہیں۔ جمیل
قریشی نے اپنی کتاب ''زخمِ نیم شب'' میں لکھا ہے کہ ''میری شاعری کا
دوسرا جنم ۱۹۸۲ء میں ہوا۔ جب میں راجستھان کے خوبصورت شہر اودے
پور میں مقیم ہوا''۔ اور وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے تک اودے پور
ہی میں رہے۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ ''زخمِ نیم شب'' یہیں اودے پور سے
ہی منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ کو اودے پور کے خوش گلو شاعر اقبال ساگر نے
ترتیب دیا ہے۔ ایک مجموعہ فخر الدین علی احمد میموریل کی مالی امداد سے
نکلوانے کی کوشش کی تھی، جس کا نام ''طاؤس رنگ'' رکھا تھا مگر وہ کوشش
صرف کوشش ہی رہی۔ مجموعہ نہیں نکل پایا۔

جمیل قریشی نے کتابت کا کام یہاں اودے پور میں رہ کر ہی
سیکھ لیا تھا ان کی کتابِ ''زخمِ نیم شب'' کی کتابت خود انھوں نے اپنے ہاتھوں سے
کی ہے۔ جمیل قریشی کا کلام ہندو پاک کے رسالوں میں متواتر چھپتا رہا ہے۔ مگر ان
دنوں ان کا کلام کہیں نظر نہیں آرہا ہے۔ جب تک اودے پور میں تھے بڑے
تروتازہ تھے۔ بھوپال جانے کے بعد ان کی ادبی سرگرمیاں ختم سی ہوگئی ہیں۔

غزلیں

ابتدا میں انتہا سے باخبر میں نے کیا
اس طرح اس داستاں کو مختصر میں نے کیا

جن کو دعویٰ تھا وہ پہلے ہی قدم پر رک گئے
دھار پر تلوار کی تنہا سفر میں نے کیا

کب ٹھہرتی تھیں نگاہیں اس ہجومِ رنگ پر
وہ نظر آیا تو خود کو بے نظر میں نے کیا

رفتہ رفتہ بجھ گئے جب اس کے سارے ہی چراغ
اس کی یادوں سے فروزاں اپنا گھر میں نے کیا

دیکھ مجھ کو، کیوں ہوا جھوٹی انا کا میں شکار؟
بے سبب اس نرم دل کو چشمِ تر میں نے کیا

○

کوئی سراغ سمت سفر کا وہاں نہ تھا
پانی پہ نقشِ پا کا کہیں بھی گماں نہ تھا

اندر لگی تھی آگ مگر بے خبر تھے لوگ
جلتے ہوئے مکان سے باہر دھواں نہ تھا

غم کا بہت ہجوم تھا آنکھوں کی جھیل میں
کائی جمی تھی یوں کہ وہ آبِ رواں نہ تھا

وہ خوف کے حصار سے باہر نہ آسکا
گو فاصلہ کچھ اس کے مرے درمیاں نہ تھا

سچ بولنے لگا تو کسی نے سنا نہیں
اک شخص جس کا جھوٹ کبھی رائگاں نہ تھا

جس کے ستم سے سینۂ صد چاک میں ہی تھا
وہ اٹھ گیا تو دیدۂ نمناک میں ہی تھا

حیرت زدہ نگاہِ ستم گر مجھ ہی پہ تھی
پہنے بدن پہ زخم کی پوشاک میں ہی تھا

بے فکر و مطمئن تھے کہ لاعلم تھے سبھی
بستی میں اک گزیدۂ ادراک میں ہی تھا

سب لوگ چپ کھڑے تھے وہاں مصلحت بدوش
حق بات میرے لب پہ تھی، بے باک میں ہی تھا

بدنام تھا میں حلقہ بگوشی میں گو جمیلؔ
اس کی عنایتوں سے مگر پاک میں ہی تھا

○

خنجر ہوا کا شوخ کلی کے بدن میں تھا
تازہ لہو کا رنگ نئے پیرہن میں تھا

سورج کے سائبان سے باہر نہ آئے لوگ
آسیب جیسے سایۂ سرو سمن میں تھا

کیا جانے مجھ پہ کس طرح اوچھا پڑا تھا وار
ورنہ وہ شخص طاق بہت اپنے فن میں تھا
بے اعتنائی میرا مقدّر بنی رہی
تنہائیوں کا زہر مرے جان و تن میں تھا
ہر شمع شب گزیدہ رہی صبح تک وہاں
بس اک چراغِ حاصلِ شب انجمن میں تھا

○

کوئی چہرہ ذہن و دل کے روزن و در میں نہ تھا
روشنی کا داغ تک تاریک منظر میں نہ تھا
میرے دروازے پہ دستک دے کے سُورج بھی گیا
میں اسیرِ شب تھا دن میرے مقدّر میں نہ تھا
صرف پتھرائی ہوئی آنکھیں تھیں بستر پر دراز
ہجر کی شب جا چکی تھی کوئی بھی گھر میں نہ تھا
ہر سپاہی سر بریدہ ہو کے بھی ہنستا رہا
شائبہ تک رنج کا مغلوب لشکر میں نہ تھا
چند لمحوں کا تھا وہ طوفان پھر ٹھنڈا پڑا
ظرف گہرائی کا جو شیلے سمندر میں نہ تھا

ارشد عبدالحمید

نام ارشد حسن خاں۔ والد کا نام عبدالحمید خاں مجیدی، ادبی نام ارشد عبدالحمید۔ ۱۳/اپریل ۱۹۵۸ء کو ٹونک میں پیدا ہوئے۔ اردو میں ایم، اے کرنے کے بعد رفعت اختر صاحب کی سرپرستی میں پی، ایچ، ڈی کی اور اردو کے استاد کے طور پر سرکاری ملازمت میں آگئے۔ ۱۹۷۵ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ہندوپاک کے رسالوں میں کلام ۱۹۷۸ء سے متواتر چھپ رہا ہے۔ کیوں کہ ارشد عبدالحمید نے ۱۹۷۵ء میں شاعری کی شروعات کی، اس لیے ان کی شاعری پر جدیدیت کا اثر پڑنا ہی تھا، کیوں کہ یہ زمانہ جدید شاعری کے عروج کا زمانہ تھا اس لیے ان کی شاعری پر محمد علوی، ناصر کاظمی، ثروت حسین، بانی، شکیب جلالی، زیب غوری جیسے شاعروں کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔

ارشد عبدالحمید کا مطالعہ بہت وسیع ہے اس لیے وہ غزل کی روایت سے بخوبی واقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل بڑی نکھر کر سامنے آئی ہے۔ جسے انھوں نے اور ان کے ہم عصر لوگوں نے جدید ترین غزل کہا ہے۔ میں شاعری کو خانوں میں بانٹنے کا قائل نہیں مگر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کی غزل اچھی غزل میں شمار ہوتی ہے۔ ارشد عبدالحمید نے غزل کے ساتھ ساتھ نظمیں اور دوہے بھی کہے ہیں مگر بنیادی طور پر وہ غزل ہی کے شاعر ہیں۔ اودے پور میں کہی گئی غزلوں کا معیار اس قدر بلند تھا کہ محمود ایاز جیسے مدیر نے اپنے رسالے میں جگہ دی۔

ارشد عبدالحمید نثر بھی بہت اچھی لکھتے ہیں۔ ان دنوں وہ اپنے وطن ٹونک میں مقیم ہیں اور گورنمنٹ کالج میں اپنی ملازمت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

غزلیں

نظر میں آشتی سر میں لہو بھی دیکھتا ہے
مجھے تو رشک سے میرا عدو بھی دیکھتا ہے

میں شور شوں میں بھی دل کو عزیز رکھتا ہوں
یہی تو ہے جو پسِ ہاؤ ہو بھی دیکھتا ہے

چراغ انھیں کی وساطت سے جل رہا ہے مگر
کبھی ہواؤں کو وہ تند خو بھی دیکھتا ہے

مجھے یہ موتی سمندر یونہی نہیں دیتا
وہ میرے حوصلے بھی جستجو بھی دیکھتا ہے

یہ دل اسیر ترے نقشِ پا کا ہے لیکن
جو چوک جائے تو پھر چار سو بھی دیکھتا ہے

مرے جنوں کو دونوں عزیز ہیں جاناں
یہ دشت و در ہی نہیں آبجو بھی دیکھتا ہے

سیاہ برگ ثمر جمع ہو گئی ارشدؔ
مگر یہ دل کہ مآلِ نمو بھی دیکھتا ہے

○

غلط نہیں ہے دلِ صلح خو جو بولتا ہے
مگر یہ حرفِ بغاوت ، لہو جو بولتا ہے

مرے اجڑنے کی تکمیل کب ہوئی جاناں
درختِ یاد کی ٹہنی پہ تُو جو بولتا ہے

سرِ سکوتِ عدم کس کے ہونٹ ہلتے ہیں
کوئی تو ہے پسِ دیوارِ ہُو جو بولتا ہے

زمانے تیری حقیقت سمجھ میں آتی ہے
ہوا کی تھاپ سے خالی سُبو جو بولتا ہے

ادھر یہ کان ہیں قہرِ خزاں جو سنتے ہیں
ادھر وہ پیڑ ہے سحرِ نمو جو بولتا ہے

نفاستوں کا قرینہ ہے میری خاموشی
مگر یہ جیب کا تارِ رفو جو بولتا ہے

نفس کے جال میں کب قید ہو سکا ارشدؔ
وہ اک پرندِ وفا کُو بہ کُو جو بولتا ہے

○

مرے خیمے خستہ حال میں ہیں، مرے رستے دھند کے جال میں ہیں
مجھے شام ہوئی ہے جنگل میں مرے سارے ستارے زوال میں ہیں
مجھے رنگوں سے کوئی شغل نہیں مجھے خوشبو میں کوئی دخل نہیں
مرے نام کا کوئی نخل نہیں مرے موسم خاک ملال میں ہیں
یہ دنیا ہے اکبر ظلموں کی ہم مجبوری کی انارکلی
ہم دیواروں کے بیچ میں ہیں ہم نرغۂ جبر و حلال میں ہیں
اک مغرب آیا مشرق میں مری فوج کے ٹکڑے کر ڈالے
اب آدھے سپاہی جنوب میں ہیں اور آدھے سپاہی شمال میں ہیں
ایمان کی چھاگل پھوٹ گئی اعمال کی لاٹھی ٹوٹ گئی
ہم ایسے گلہ بانوں کے سب ناقے خوفِ قتال میں ہیں

○

مری پونجی میری حیرت ہے مجھے غیر کے مال سے کیا لینا
مجھے تیرے جواب سے کیا نسبت، مجھے تیرے سوال سے کیا لینا
دکھ کون سے اونچے دام کے ہیں سکھ کون سے ایسے کام کے ہیں
ہم بندے تیرے نام کے ہیں ہجر و وصال سے کیا لینا
شب ماضی و حال کی جاتی ہے دن استقبال کے آتے ہیں
دل امیدوں پہ جیتا ہے اسے ماہ و سال سے کیا لینا
تو کوفۂ جاں کا قیدی ہے تجھے دجلۂ غم سے لڑنا ہے
تو خیمۂ جنگ میں تنہا ہے تجھے جنگ و جدال سے کیا لینا
مرے پاس لہو کا سونا ہے مرے پاس نمو کی چاندی ہے
میں ملکِ سخن کا شہزادہ مجھے مال و منال سے کیا لینا

ڈاکٹر پریم بھنڈاری

نام پریم سنگھ بھنڈاری، والد کا نام دلپت سنگھ بھنڈاری۔ پریم سنگھ بھنڈاری نے اپنے نام سے درمیانی لفظ "سنگھ" کو حذف کر کے اپنا ادبی نام پریم بھنڈاری بنا دیا۔ ۲۳ر ستمبر ۱۹۴۹ء کو یہیں اودے پور میں پیدا ہوئے، اور یہیں سکھاڈیا یونیورسٹی سے پہلے موسیقی میں اور پھر سماجیات میں ایم، اے کرنے کے بعد ہندوستانی غزل گائیکی میں پی، ایچ، ڈی کی اور ہندوستان میں غزل گائیکی پر ایک کتاب لکھی، جو ہندی رسم الخط میں شائع ہوئی جس کی سنگیت کی دنیا میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس کتاب کا پیش لفظ نوشاد علی نوشاد نے لکھا۔ ۱۹۹۰ء میں پریم بھنڈاری کی غزلوں کا مجموعہ "جھیل کنارے تنہا چاند" منظر عام پر آیا۔ اس کتاب کی تعریف میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس مجموعے کی تعریف گوپی چند نارنگ جیسے عظیم ناقد نے اپنے خط میں پریم بھنڈاری کو لکھا کہ جھیل کنارے تنہا چاند جدید اردو غزل کا ایک اہم مجموعہ ہے جسے کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا" اس مجموعہ کو ہندوپاک میں بھی بہت پسند کیا گیا۔ پریم بھنڈاری کی غزلیں اس قدر آسان زبان میں ہیں کہ قاری پر ذرا بھی بارِ نہیں گذرتا۔ اس مجموعہ کو پریم بھنڈاری نے ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں ایک ساتھ شائع کیا ہے۔ پریم بھنڈاری ایک اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی اچھے غزل گایک بھی ہیں۔ سنگیت پر ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بڑے مترنم الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔

پریم بھنڈاری بہت کم شعر کہتے ہیں مگر برابر کہتے رہتے ہیں۔ اس لیے امید کی جا سکتی ہے کہ جلد ہی ان کا دوسرا مجموعہ منظر عام پر آجائے گا۔

غزلیں

پیار کہاں اب سمجھوتہ ہے
کچھ دن بعد یہی ہوتا ہے

اب یہ دکھاوا کم تو نہیں ہے
ہنستا چہرہ دل روتا ہے

اڑجائیں گے خواب کے پنچھی
کھول کے پلکیں کیوں سوتا ہے

دل میرا کیوں اس کی انا کا
ان چاہا بوجھا ڈھوتا ہے

میں جب بھی غزلیں کہتا ہوں
اُس کا دکھ میرا ہوتا ہے

○

افق سے آ کے یہ نیچے اتر گیا کیسے
بلند آسماں دھرتی پہ گر گیا کیسے

نہ ریت ہی کا بنا تھا نہ پھول جیسا تھا
لگی جو ٹھیس ذرا سی بکھر گیا کیسے

سجا سجا یا ہوا جانے کیسا لگتا تھا
پہن کے سادگی اتنا نکھر گیا کیسے

نہ آرزو تھی نہ امیدّ تھی نہ خواہش تھی
قلم کے زور پہ زندہ تھا، مر گیا کیسے

اگرچہ بولتا چہرہ نہیں تھا اس کا تو
کٹی زبان سے پھر بات کر گیا کیسے

○

دریا ہے اپنے جوش میں کچا گھڑا ہوں میں
اپنے وجود کے لیے پھر بھی لڑا ہوں میں

سورج کبھی جو پشت پہ آکے کھڑا ہوا
کہنے لگا یہ سایہ بھی، تجھ سے بڑا ہوں میں

قسطوں میں کاٹ ڈالیں گے مجھ کو شہر کے لوگ
تنہا لبِ سڑک جو شجر سا کھڑا ہوں میں

میں حرفِ بے مثال ہوں مجھ کو برت کے دیکھ
بوسیدہ اک کتاب میں کب سے گڑا ہوں میں

لفظوں کے تیر طنز کے نشتر تھے اس کے پاس
خاموش رہ کے پھر بھی برابر لڑا ہوں میں

○

آنکھ کا بادل سوکھ چکا ہے
پھر ساون سا کیا برسا ہے

چہرہ پڑھ کر کیا جانو گے
اندر اندر کیا ٹوٹا ہے

میرے تن کو چھو کر دیکھو
مٹی، پانی، آگ ہوا ہے
دل نہ مانے اٹھ کر دیکھو
کوئی نہیں ہے صرف ہوا ہے
بہت دنوں میں غزل ہوئی ہے
سوچ کا اک چشمہ پھوٹا ہے

○

میرا ہر لمحہ بیتا ہے بگڑی بات بنانے میں
آدھی عمر کٹی جھگڑے میں آدھی عمر منانے میں

آگ زنی کا آیا ہے الزام مجھی پہ کیوں یارو
ہاتھ جلے ہیں میرے تو بستی کی آگ بجھانے میں

بادل ہی کا کام نہیں پاتو کے چھالے بھی شامل ہیں
تم چاہے مانو نہ مانو ریت کی پیاس بجھانے میں

شکوے شکایت پیار محبّت سامنے ہو تو اچھا ہے
دیر بہت لگتی ہے یوں بھی خط کے آنے جانے میں

دور کے پتھر موتی ہیں مٹھی کے موتی ہیں پتّھر
بس اک فرق یہی دیکھا ہے پانے اور گنوانے میں

شبّیر رضاؔ

نام شبّیر احمد خاں۔ والد کا نام محمد عثمان خاں۔ ادبی نام شبّیر رضاؔ۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۳۶ء کو امل نیرؔ، ضلع جلگاؤں، (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ والد انجینئر تھے۔ شبّیر رضا جب پندرہ سال کے رہے ہوں گے کہ ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ تلاشِ معاش میں راجستھان میں اور سپاہیوں میں بھرتی ہونے کے بعد جلد ہی اسسٹنٹ جیلر ہو گئے۔ مگر ۱۹۵۹ء میں اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر جیل کے محکمہ میں ملازم ہو گئے۔ ملازمت کے دوران جے پور، اجمیر، کوٹہ اور بھیلواڑہ میں قیام پذیر رہے۔ اس دوران کچھ عرصہ بھوپال میں بھی گذارا۔

شاعری کی شروعات ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ ابتدائی دور میں عرشی اجمیری کو کلام دکھایا اور اپنا تخلص ہماؔ رکھ لیا۔ شفاؔ گوالیاری کے بھی شاگرد رہے۔ ۱۹۷۶ء میں اودے پور آگئے اور ۱۹۹۴ء میں اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر یہیں سکونت پذیر ہیں۔ اودے پور میں آنے کے بعد یہاں کے جدید شاعروں کے زیرِ اثر نئی شاعری کرنے لگے اور اپنا تخلص ہماؔ امل نیری سے بدل کر شبّیر رضاؔ رکھ لیا۔ شبیر صاحب میں ایک خاص بات یہ بھی پائی جاتی ہے کہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے میں یقین رکھتے ہیں، دوران ملازمت یہاں اودے پور میں رہ کر بی، اے کیا اور اب ملازمت سے فارغ ہو کر کمپیوٹر کا کورس کر رہے ہیں۔

غزلیں

نہ جانے ترکِ تعلق کے بعد بھی اب تک
ہر ایک پل کیوں تیرا انتظار رہتا ہے

کیوں تیری یاد ستا تی ہے بارہا مجھ کو
کیوں تیری یاد میں دل بے قرار رہتا ہے

بہار کیوں مجھے اب بھی فریب دیتی ہے
ہوا کا جھونکا تیری یاد کیوں دلاتا ہے

ہر اک شاخ کیوں مستا نہ وار ہلتی ہے
چمن کا پتہ بہم تالیاں بجا تا ہے

چمن میں پھر سے تری جیسے آ مد آمد ہو
ہر ایک پھول یہی مسکرا کے کہتا ہے

بتا کیا واقعی تو پھر سے آنے والا ہے
بتا بہار کی رعنائیاں کیا دھو کہ ہے

○

جز نقش پائے یار نہ سجدہ کریں گے ہم
تجھ کو جبینِ شوق نہ رسوا کریں گے ہم

ہو گی کبھی تو عشق میں یہ بات بھی نصیب
روٹھے گا کوئی اور منایا کریں گے ہم

روٹھی ہوئی بہار اگر یاد آگئی
دورِ خزاں میں اشک بہایا کریں گے ہم

آ جا کہ انتظار میں کب تک شبِ فراق
آنکھوں کے اپنے دیپ جلایا کریں گے ہم

دے تو گئے ہیں جھوٹی تسلی سی اے ہما
کہہ تو گئے ہیں خواب میں آیا کریں گے ہم

○

ہر لمحہ کیا میں نے تجھے ہو ثریا یاد
لیکن نہ کیا تو نے کبھی مجھ کو ذرا یاد

وہ برق کا گرنا وہ نشیمن کی تباہی
اب تک ہے مرے دل کو وہ غمگین فضا یاد

اللہ رے یہ کہنا کسی کا سرِ محفل
کیوں آپ یہاں آئے یہاں کس نے کیا یاد؟

کیا نظم غلط ہے ترے میخانے کا ساقی!
سب کو تو پلائی مگر آیا نہ ہما یاد

○

نہ جانے کتنے عرصے سے سورج نہیں دکھا
سورج مکھی کا پھول یونہی سرنگوں رہا

انگارہ لے کے بچّے نے فوراً نگل لیا
میں ڈرتے ڈرتے صرف اسے ڈانٹتا رہا

اوروں سے کہہ رہا تھا کہ ڈرنا نہیں کبھی
اور آج اپنے سایہ سے میں خود ہی ڈر گیا

جب بھی ملا بلکتا ہو راہ میں فقیر
اک کھوٹا سکّہ میں نے دیا اور چل دیا

ایک سوٹ کیس مجھ کو ملا تھا ٹرین میں
دیکھا تو اس میں ایک تھا بچّہ مرا ہوا

○

کلی کلی کے تبسم سے ہو رہا ہے عیاں
قفس نصیبوں سے واقف مگر بہار نہیں

قرار واقعی اک ہاتھ اور اے قاتل
کہ تیرے کشتۂ غم کو ابھی قرار نہیں

بہار کو کبھی رنگینیاں نہ ہوں گی نصیب
اگر چمن میں مرا جانے صد بہار نہیں

میں ان کے واسطے دنیا کو چھوڑ بیٹھا ہوں
الٰہی پھر بھی انھیں میرا اعتبار نہیں

انوؔر سلیم

نام انوؔر علی شیخ ، ادبی نام انوؔر سلیم ، والد کا نام محمد حسین شیخ ہے۔ انوؔر سلیم ۲/ فروری ۱۹۴۸ء کو ادے پور میں پیدا ہوئے۔ یونیورسٹی آف ادے پور سے ۱۹۶۹ء میں بی ، اے ، اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ۱۹۸۵ء میں ایم ، اے کیا۔ ۷۰ سے ۸۰ کے دوران تنزانیہ (عمان) میں انگریزی کے استاد کے طور پر ملازمت میں رہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ حیدرآباد میں سکونت پذیر ہیں۔

انھوں نے ۱۹۶۵ء سے شاعری کی شروعات کی اور ۱۹۶۸ء سے متواتر ہندوپاک کے رسالوں میں چھپ رہے ہیں۔ کیونکہ شاعری ۷۰ کے دہے میں شروع کی۔ اس لیے اپنے آپ کو جدید شاعر کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ابتدائی دور میں دوہے بھی کہے مگر ذہنی طور پر وہ نظم اور غزل کے بہت قریب ہیں :

دکھا کے روشنیوں کا ذرا سا اک منظر

وہ مانگتا ہے حسیں عکس کالی جھیلوں سے

یہ شعر بہت کم کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے اب تک ان کا مجموعہ نہیں نکل پایا۔ کسی کی شاگردی قبول نہیں کی۔ ادے پور میں تھے تو اپنا کلام دوستوں کو سناتے ضرور تھے مگر کسی کا مشورہ قبول نہیں کرتے تھے۔ مطالعہ ضروری ہے مگر شاید وقت کی کمی کی وجہ سے وہ اس اور دھیان نہیں دے پائے۔ بہر کیف یہ خوشی کی بات ہے کہ انور سلیم کا تخلیقی سفر جاری ہے۔

ستّر مساوی ایک

نافرمان بچے کا بھی بوجھ اٹھائے

ہاں !
تھکتی، نہیں ہے

تو، تو

۷۰ = ۱ (ستر مساوی ایک)

نافرمان سہی......

میں بدکار سہی

ایقان مگر یہ ہے

۷۰ = ۱، ۷۰ = ۱

کالے لوگوں کا شہر

کنارے سمندر کہ ہے روشنی شہر کی

کالے لوگوں کا یہ شہر ہے

جو ابھی خواب سے بس اٹھے ہیں

ابھی بے چارے بہت درد دکھ سہ چکے ہیں

انھیں اب یہ محسوس ہونے لگا ہے

کہ ہم بھی تو انسان ہیں !

اور اب ان کے بیدار لوگوں میں

نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے ہیں

یہ کہنے لگے ہیں

کہ رنگوں کی تفریق کا یہ سبق

تم کو کس نے سکھایا

تم بھول جاؤ کہ ہم کون کیا تھے

تمھیں یہ بتائیں گے ہم کون کیا ہیں

غزلیں

رنگ و شکل و روپ کے ہیں مختلف چہرے یہاں
ہاتھ کی ریکھائیں دیتی ہیں مگر پہرے یہاں

ٹوٹتے ہی جارہے ہیں کانچ کے برتن مگر
کرچیوں کے زخم ہوتے ہی نہیں گہرے یہاں

وادیوں آبادیوں سے آ رہی ہے اک صدا
میں ہوں زندہ اور کوئی بھی نہیں ٹھہرے یہاں

چیخ اندر کی ہو یا باہر کی، حاصل کچھ نہیں
سب کے سب لگتا ہے مادر زاد ہیں بہرے یہاں

سات رنگوں کی کمانیں رقص میں تھیں اس طرف
زرد پھولوں کے لٹکتے تھے مگر سہرے یہاں

○

ریزہ ریزہ ہو رہا تھا جب زمانے کا ضمیر
آئینہ اک ایسا اترا نور تھا جس کا خمیر

خوف کی تختی پہ اپنا نام پہلے لکھ دیا
کھینچ دی پھر اس کے اوپر روشنی کی اک لکیر

ایک تحفہ خوشبوؤں کا دے کے مجھ کو چل دیا
اب نہیں کچھ یاد وہ تھا کون سی رُت کا سفیر

اس چمن کے پھول سارے کیا مری میراث ہیں
سوچتا ہے رنگ وبو کے دائرے کا اک اسیر

پوچھتا ہے شہر کا سناٹا تجھ سے اے سلیم
کیوں چھپا رکھے ہیں اپنی چیخ کے ترکش میں تیر

○

چھپی ہیں کرچیاں بھی کانچ کے کھلونے میں
یہ سوچ کر ہی اسے رکھ دیا ہے کونے میں
ہوا چلے گی تو ہر سمت پھیل جاؤں گا
اگرچہ ڈھیر ہوں مٹی کا ایک کونے میں
یہ جان لو کہ سمندر کی تہہ میں کیا شے ہے
مزہ ملے گا تمھیں کشتیاں ڈبونے میں
ہٹا کے چہرے سے گرد و غبار کیا کچھ
ہیں تیرے شہر کی رسوائی ان کے دھونے میں
مرے وجود کا پتھر رہے گا کیا سالم
چھا ہی کیا ہے کھنڈر کے غبار ہونے میں
سلیمؔ جھولی میں موتی ہیں کتنی راتوں کے
بکھر نہ جائیں کرن در کرن پرونے میں

○

تم بھی چپ اور ہم خاموش
جانے اس میں کس کا دوش
پلکیں اپنی بھیگ گئیں!
خالی ہے اب دل کا کوش
لوگ ہیں سارے ایک سمان
دنیا میں کس کو سنتوش
ہر چہرے پہ معصومی
کس کو ہم کہتے نردوش
دل جو میرا بدلے تو
دھارن کرلوں اُجلے پوش

حفیظ آلا یمان

نام عبدالحفیظ خاں، والد کا نام عبدالشکور خاں شہید نازؔ۔ حفیظ الایمان کو اختر الایمان کی شاعری نے اس قدر متاثر کیا کہ انھوں نے اپنا ادبی نام حفیظ الایمان رکھ لیا۔ مگر ان کی شاعری میں اختر الایمان کہیں نظر نہیں آتے۔ کیونکہ حفیظ الایمان نے جو شاعری کی ہے وہ کئی اصناف میں بٹی ہوئی ہے۔ وہ کبھی نظم، کبھی غزل، کبھی دوہا، کبھی ہائیکو کہتے رہتے ہیں۔ ان کا اپنا اب تک کوئی مزاج نہیں بن پایا کہ ان کو کیا کرنا ہے۔ حفیظ الایمان ۱۹۴۸ء کو اودے پور میں پیدا ہوئے۔ بی، اے تک تعلیم حاصل کرکے سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ شاعری تو وہ ۱۹۶۹ء سے کر رہے ہیں مگر چھپنے کی طرف دھیان کم ہی دیا ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں وہ ''تحریک'' میں چھپا کرتے تھے۔ شاعری کے لیے مطالعہ از حد ضروری ہے مگر حفیظ الایمان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ اس لیے شاعری ٹھیک سے نہیں کرپائے مگر وہ شاعری کو ٹھیک سے چھوڑ بھی نہیں پائے ہیں۔ کیونکہ شاعری ان کو ورثے میں ملی ہے۔ ان کے والد عبدالشکور شہید نازؔ بڑے اچھے نعت گو تھے۔

غزل

ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی تھال
مٹی میں ہے ساری دال

بربادی کے ہیں یہ حال
دیکھو میرے الجھے بال

جانے کیا وہ سوچ رہی تھی
کٹ گئی انگلی کٹی نہ آل

میں نے جب کچھ کہنا چاہا
اس نے ڈالی منہ پہ شال

نظم

مشعلیں بجھ گئیں
غم نہ کرو
میں ابھی زندہ ہوں

نئی تاریخ

آخر تم کیا ڈھونڈ رہے ہو
تاریخوں میں
اتہاسوں میں
میری سونی آنکھیں دیکھو
ان آنکھوں میں
ایک نئی تاریخ چھپی ہے

نظم

میں جب آیا
اس دھرتی پر
کتنے جگ مگ دیپ جلے ہیں
ویرانوں میں پھول کھلے ہیں
مجھ سے پہلے
یہاں بہت گھنا تھا جنگل
گھور اندھیروں کی اک دلدل

واپسی

کیوں اتنے خاموش کھڑے ہو
تم آخر کیا سوچ رہے ہو
امّی کب سے پاس کھڑی ہے
دادی اندھیارے میں پڑی ہے
میرے لیے کیا لائے ہو بولو
دیکھوں اٹیچی تو کھولو

O

ہٹ بھی جاؤ، رستہ چھوڑو
اب میں تم کو کیا بتلاؤں
لوہے کے اس شہر میں جاکر
وہ آنسو بھی کھو آیا ہوں
جو پلکوں پر لے کے گیا تھا

بے بسی

کیسے بتاؤں
پلکوں پر رم جھم برساتیں
کاندھے پر بوجھل زنجیریں
دن میں دہکتی اگنی لے کر
کہاں، کہاں، میں مارا پھرا ہوں
آج، مگر، یہ سوچ رہا ہوں
جیون کے کس موڑ پہ جانے
الجھی راہیں
چھوڑ کے، گم ہو جائیں، مجھ کو
اور میں اس دنیا کی نظر میں
افسانہ بن کر رہ جاؤں

دوہے

تو ہے ایسی نار سلونی کوئی تجھے سمجھ نہ پائے
تو ہی جلتے دیپ بجھائے تو ہی بجھتے دیپ جلائے
نیل گگن کی اُوٹ سے گوری جھانکے سانجھ کی بیلا
آؤ من کی سن لیں سنالیں جیون ہے اک میلا
رام کے روپ میں بھیس بدل کر سب دیں گے اُپدیش
من کی بات نہ کہیو کسی سے، یہ پتھر کا دیش

مشکور جاوید

نام مشکور احمد خاں۔ ادبی نام مشکور جاوید۔ والد کا نام اسماعیل احمد خاں۔ تعلیم بی ،اے۔ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اودے پور ہی میں پیدا ہوئے۔ لکھنا پڑھنا ۱۹۷۰ء کے آس پاس شروع کیا۔ اپنے ابتدائی دور میں افسانے لکھے۔ پھر مقامی شعرا کے زیر اثر شاعری شروع کر دی۔ مہارانا بھوپال کالج میں طالبِ علموں کی بزم ''بزمِ ادب'' کے سیکریٹری رہے اور ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ جس میں پہلی بار محمد علوی جیسے جدید شاعر کو اودے پور بلایا گیا۔ اس مشاعرے میں کیفؔ بھوپالی اور دوسرے شعرا حضرات بھی تھے۔ مگر محمد علوی اس مشاعرے میں بہت کامیاب رہے۔ مشکور جاوید بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں وہ شاعری تو نہیں کرپائے مگر افسانے متواتر لکھتے رہے۔ ان دنوں ان پر ایک جمود سا طاری ہے ،نہ افسانہ نہ شاعری۔ صرف اپنی ملازمت کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں۔

تتلیاں

تمھارے مکانوں میں

ان کھڑکیوں سے

دھواں بھر گیا ہے

جب تک ہوائیں

نہیں آئیں گی

دھوپ سر کو

جھکائے ہوئے

بے صدا ہی گذر جائے گی

تتلیوں کے سفر

سفر سے نہ گھبراؤ تم

تتلیاں ایک دن

لوٹ کر آئیں گی

جستجو

چلو آؤ ہم تم

موسموں سے مل کر

ان جنگلوں میں

اترتی ہوئی شام کو

اپنی بانہوں میں بھر لیں

اور ریت کی

بارشوں میں نہاتے ہوئے

بادلوں کو اچھالیں

کبھی تم میرے نام

دھوپ کی کشتیوں میں بٹھا کر

ہواؤں سے باتیں کرو

یونہی ہنستی رہو

آسمانوں سے پانی برستا رہے

میں ریل کی پٹریوں سے گذرتا رہوں

اور تم میری جستجو میں بھٹکتی رہو

ایک شام

آج پھر شام نے
چائے کی پیالیوں میں کہیں
اداسی میں
لپٹا ہوا آسماں بھر دیا
دل کے اندر
اترتی ہوئی شکل نے
ایسا کچھ کر دیا
بے چین لمحو رکو
اس طرف ہی چلو
جس طرف کوئی
گیا ہی نہ ہو

نظم

قید سے نکلا تو دیکھا
شہر مجھ سے دور تھا
راستے سنسان تھے
اور پت جھڑ آچکا تھا

سزا

گھومتی ہوئی اس زمیں سے
کتنے سائے بکھر کر
کہیں آسمانوں میں اڑنے لگے
چیل کی آنکھ نے
ان کی تصویر لے کر
تمھارے مکانوں کی
چھت پر سجادی

مشتاق چنچلؔ

نام مشتاق حسین شیخ، والد کا نام غلام حسین شیخ۔ ادبی نام مشتاق چنچلؔ۔ ۳؍ جون ۱۹۴۲ء کو یہیں اودے پور میں پیدا ہوئے۔ اردو میں ایم، اے کرنے کے بعد بی، ایڈ کیا۔ اور سرکاری طور پر مدرس ہو گئے۔ شاعری کی شروعات ۱۹۶۰ء کے آس پاس ہو چکی تھی، جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے۔ شاعری بہت سادہ زبان میں کرتے ہیں۔ اپنی شاعری میں طنز و مزاح کا رنگ ہونے کی مناسبت سے ہی انھوں نے اپنا تخلص چنچلؔ رکھا ہے۔ اپنی شاعری میں ہندی اور انگریزی لفظوں کا استعمال اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ جیسے وہ لفظ اسی کام کے لیے بنا ہو۔

مشتاق چنچلؔ کی شاعری کے موضوعات خاص طور پر ماحول کی آلودگی، خاندانی منصوبہ بندی، وطن پرستی، قومی یکجہتی اور وقتی طور پر ہونے والی سیاست رہے ہیں۔ مشتاق چنچلؔ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ کتابت کا ہنر جانتے ہیں اس لیے اپنے مجموعہ کی کتابت خود ہی کرنے کا ارادہ ہے۔

پانی

دور دریا کی سطح سے طے کیے لمبے سفر
چیختا چلاتا، بجلی کڑکڑاتا تیز تر
مندر و مسجد ، گرودوارہ فصیلِ چرچ پر
رُوپ میں بادل کے آوارہ گرجتا در بدر

تشنہ لب ہر کھیت کو سیراب میں کرتا ہوا
بام ودر پہنچا کوئیں تالاب میں بھر تا ہوا

میں لہر جمنا کی اور گنگا کی دھارا تیز گام
سورن مندر اور پشکر میں میرا پاون مقام
خواجۂ اجمیر کے کاسے کی زینت میں تمام
مجھ کو دیوی ، دیوتا ، شاہ وگدا کرتے سلام

میں ہی دریا کا تلاطم میں سمندر کا سکوت
میرے ہی دم سے لبِ کہسار پہ شاہِ بلوط

میں کہ تہذیب وتمدّن کی نمایاں اک کتاب
میرے دم سے رونق دستورِ محفل کامیاب
میرا اک اک کارنامہ پُرشباب ولاجواب
تھال میں رکھ دو مجھے تو قید کر لوں ماہتاب

میرے جھرنوں کی صدا ایجاد سرگم کے لیے
کام میں آتا ہوں میں ہی خیر و مقدم کے لیے

وقت نے انگڑائی لی بدلا زمانے کا نظام
حضرتِ انسان کے آتے ہی ہاتھوں میں لگام
میری دلکش آبرو کا بس ہوا قصہ تمام
آج گندی نالیوں غٹروں میں ہے میرا مقام

پہلے سی عزّت بھلا اب میری قسمت میں کہاں
نیکی کا برتاؤ خوئے آدمیّت میں کہاں

جابہ جا سینے پہ میرے گندے نالوں کی قطار
ناردانوں کی نمائش کوڑا کرکٹ بے شمار
گھر کا پے خانہ مل و پیشاب اور عرقِ خمار
مجھ ہی سے پاکیزگی اور مجھ ہی سے بالاتکار

کیسی مٹی سے بنائی آتما انسان کی
آدم کی اولاد ہے یا جڑ ہے یہ شیطان کی

سب بہادیتے ہیں مجھ کو مفت بیکار و فضول
خصلتِ بدکار یہ ہرگز نہیں مجھ کو قبول
ہو صحیح اُپیوگ میرا تو کھلیں آنگن میں پھول
پھر سے ہوں سرسبز جنگل، جو چلیں حسبِ اصول

میری اک اک بوند گوہر کام جو آنے لگے
پرچمِ ہندوستاں دنیا پہ لہرانے لگے

جنگل اور کلہاڑی

کیابتاؤں بات لگتی ہے عجیب
اس شہر سے چند میلوں کے قریب
دھرتی کے سینے پہ زیرِ آسماں
اک گھنا پُر کیف جنگل تھا یہاں
جس کے ہر جانب تھی پیڑوں کی قطار
مخملی سبزہ ہی سبزہ بے شمار
چارسو کیکر ببول اور ساگوان
جیسے ہوں تعینات سرحد پر جوان
نیم ، شیشم ،آم،برگد بے مثال
جیسے بن میں ہو کوئی منڈپ وشال
جیسے اس منڈپ میں شرمائی دلہن
دخترِ صحرا ہو شادی میں مگن
مور،کوئل ،بلبلیں نغمہ طراز
قدرتی منظر وہ دلکش دلنواز
تھے کہیں چیتل،چکارے دوڑتے
بارہ سنگھے ڈالیوں کو توڑتے
پتوں کے گرنے کی سنتے ہی صدا
جھاڑی سے خرگوش نکلا، وہ گیا

نہ کوئی شکوہ شکایت اور بھوک
بے وجہ کچھ بندروں کی ہوک ہوک
پیڑ کی ہلتی لچکتی ڈالیاں
جیسے کہ ہو کیرتن قوالیاں
الغرض ہر سمت چھائی تھی بہار
تھا خدا جنگل کی دیوی پہ نثار

○

اور ادھر اس شہرِ آوارہ کا حال
روٹی روزی اور رہائش کا سوال
جنم در بڑھتی ہوئی، تنگ بستیاں
جسم کے باہر ابھرتی ہڈّیاں
آبادی و مردم شماری جو بڑھی
بھوک اور بے روزگاری جو بڑھی
شہر اپنی باہیں پھیلانے لگا
رال بن دیوی پہ ٹپکانے لگا
حادثے اب روز و شب گھٹنے لگے
ہاتھ و پانو پیڑوں کے کٹنے لگے
جسم پیڑوں کے مکاں میں جڑ گئے
بے گناہ پھانسی کے پھندے چڑھ گئے
اک کلہاڑی بس قیامت بن گئی
منہ لگا خوں اور عادت بن گئی

دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کا خوں
جو ہوا، نوکِ قلم سے کیا لکھوں

....

کچھ لیے سر پر چلیں ہمجولیاں
کوڑیوں کے بھاؤ بیچیں مولیاں
لکڑیاں کچھ میرے چولہے میں جلیں
دیکھتے ہی دیکھتے راکھ ہو گئیں
چند کے صوفے بنے چند کرسیاں
چند کے دروازے دڑبے کھڑکیاں
جا لگیں چھپر تلے کچھ بلّیاں
ہو لی و کرسمس پہ کچھ کام آ گئیں
کچھ چھڑی اور تازیوں میں جا لگیں
اب ہیں جنگل میں فقط تپتے پہاڑ
یا تلہٹی میں کہیں بیروں کے جھاڑ
دور اونچے ٹیلوں پہ گنتی کے پیڑ
کھا کرے ، سالر کے بوڑھے اور ادھیڑ
بھیڑ سارے جنگلوں کو کھا گئی
یوکلپٹس کی حکومت آ گئی

محمد اسحاق خاں فرقتؔ

نام محمد اسحاق خاں۔ ادبی نام محمد اسحاق فرقتؔ۔ یکم اپریل ۱۹۴۷ء کو اودے پور ہی میں پیدا ہوئے۔ یونیورسٹی اودے پور سے ایم، اے کیا آیورویدرتن پریاگ سے کیا۔ اپنی خود کی کلینک ہے۔ شاعری ۱۹۶۶ء سے کر رہے ہیں اسکول اور کالج کی میگزنس میں کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ فرقتؔ کی شاعری میں طنز و مزاح کا پہلو نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ مقامی مشاعروں اور ادبی محفلوں میں ان کا کلام بہت پسند کیا جاتا ہے۔ فرقت نے کبھی رسالوں میں چھپنے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ فرقتؔ نے کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا۔ اپنے دوستوں کو ضرور اپنی چیزیں سناتے ہیں اور اگر کوئی کسی طرح کا مشورہ دیتا ہے تو اسے مان بھی لیتے ہیں۔ بڑے نیک انسان ہیں ان دنوں شاعری کم اور مذہبی باتیں زیادہ کرتے ہیں۔ اور اپنی حکمت کے ذریعہ لوگوں کے دکھ درد دور کرنے میں مصروف ہیں۔

درخت

دیکھو درخت اونچا کیسا کھڑا ہوا ہے

ظلم و ستم کی راہ میں جیسے اڑا ہوا ہے

طوفان ہو کہ آندھی ڈگتا نہیں ذرا بھی

اپنی جگہ سے ہرگز ہٹتا نہیں ذرا بھی

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کرتے ہیں سرد اس کو

گرمی کے گرم شعلے کرتے ہیں زرد اس کو

گرتی ہے تیز بارش پڑتے ہیں اس پہ اولے

لیکن کھڑا ہوا اب تک یہ پر کو کھولے

بچّوں کے اینٹ پتھر کرتے ہیں اس کو زخمی

لگتی ہے جب کلہاڑی رکھتا ہے یہ خموشی

ظلم و ستم جہاں کے مدّت سے سہ رہا ہے

لیکن خموش رہ کر کچھ ہم سے کہہ رہا ہے

دیکھو مجھے بھی دیکھو غم کتنے سہ رہا ہوں

لیکن جہاں کو پھر بھی پھل پھول دے رہا ہوں

رائیگاں

مرے دل کی چاہت مرے دل کا ارماں
اے مرے مہرباں اے مرے مہرباں

خیالوں میں کیا کیا نہ سوچا تھا میں نے
گلے سے کبھی بھی لگایا نہ تو نے

نہ معلوم تھا میں اکیلا رہوں گا
تمھاری جدائی کا غم بھی سہوں گا

خیالوں میں ہردم ہی کھویا رہا میں
تری یاد دل میں سمو تا رہا میں

بہاروں کے جھونکوں نے آکر جگایا
کھلی آنکھ تو میں نے کچھ بھی نہ پایا

غزلیں

رازِدل جب آشکارا ہو گیا
رازداں ہر اک ہمارا ہو گیا

راز پنہاں راز پنہاں نہ رہا
جب کسی پر آشکارا ہو گیا

کہہ دیا نظروں نے سارا ماجرا
راز افشاں ان پہ سارا ہو گیا

دل ہمارا تھا ہمارا تھا، مگر
جب تمھیں دیکھا تمھارا ہو گیا

دل پہ فرقت جب گری برقِ نظر
شیشۂ دل پارہ پارہ ہو گیا

○

شکل انساں میں ہے شیطان بڑی مشکل ہے

آج انسان کی پہچان بڑی مشکل ہے

کیا سے کیا ہو گیا انسان بڑی مشکل ہے

دیکھ کر عقل ہے حیران، بڑی مشکل ہے

پیاری گیتا ہے نہ قرآن، بڑی مشکل ہے

پیارا غالب ہے نہ دیوان، بڑی مشکل ہے

اپنے اعمال کا انجام ہے معلوم مگر

جان کر ناداں ہے انجان بڑی مشکل ہے

اپنے ہی ہاتھوں سے کرنا ہے مہیّا فرقتؔ

اپنی بربادی کا سامان بڑی مشکل ہے

قطعات

بچ کے رہیے گا آپ خاروں سے

کہ یہ دامن کو پھاڑ دیتے ہیں

اچھے خاصے حسین دامن کی

پل میں صورت بگاڑ دیتے ہیں

○

چند روزہ یہ زندگانی ہے

موت اک دن تو آنی جانی ہے

کس لیے زندگی میں اے فرقتؔ

پھر یہ آپس میں کھینچا تانی ہے

محمد حسین صغیرؔ

نام محمد حسین، والد کا نام محمد صادق علی، تخلص صغیرؔ۔ بی، اے تک تعلیم حاصل کی اور مدرّس ہو گئے۔ اب ملازمت سے سبکدوش ہو کر علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں صغیرؔ صاحب ۱۹/ اگست ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ دو تین سال کے رہے ہوں گے کہ ان کے سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا۔ والدِ محترم نے دوسری شادی کر لی اور صغیرؔ صاحب کو وہ سب عذاب جھیلنے پڑے جو ایک سوتیلی ماں کے ساتھ رہ کر کسی بچّے کو جھیلنے پڑتے ہیں۔

صغیرؔ صاحب نے پہلی غزل ۱۹۴۷ء میں کہی جب وہ فتح ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ غزل کے لیے پہلا شعر جو کہا تھا وہ یہ ہے :

کیا اندازہ لگا سکتے ہو میری طاقت کا تم
رستم و سہراب کو نیچا دکھا سکتا ہوں میں

صغیرؔ صاحب ایک عرصے تک محمد حسین اخترؔ کو اپنا کلام دکھاتے رہے، پھر کچھ عرصے تک عابدؔ ادیب کو اپنا کلام دکھایا۔ جدیدیت سے بیزار ہیں اور ترقی پسند تحریک کے ہم نوا ہیں۔ طنزیہ شاعری کرتے ہیں جو ایک دردمند دل کی آواز ہے۔

غزلیں

حرص و ہوس کا عہد ہے ظلمت کا دور ہے
فرقہ پرست اہلِ سیاست کا دور ہے
دانشوروں کی بات کو سنتا نہیں کوئی
دنیا میں احمقوں کا بہت زور و شور ہے
دراصل ہے جہاں میں قیامت اسی کا نام
دل میں ہے اور بات زباں پر کچھ اور ہے
ہے یہ تو سچ کہ کام مل گیا مزدور کو مگر
اجرت کی بات ہے وہ ابھی زیرِ غور ہے
مردوں نے چھوڑا جب سے حکومت کو اے صفیرؔ
زردار و زن مرید زنانوں کا زور ہے

○

آج کل دنیا کا دیکھو حال کیسا ہو گیا
ظلم اور بدعت کا ہر سو دور دورا ہو گیا
پہلے اس کی کوئی بھی عزت نہ کرتا تھا مگر
مل گئی کرسی تو وہ ادنیٰ سے اعلیٰ ہو گیا

جس نے اک بھاشن دیا بس وہ ہی لیڈر بن گیا
اب سیاست بھی مداری کا پٹارا ہو گیا

دیس سیوا کا جنھیں دعویٰ تھا جب آیا چناؤ
نوٹ دے کر ووٹ کا آپس میں سودا ہو گیا

جب جنتا پر ہوئی نیتا کی کرپا اے صفیرؔ
تب سے اپنے ملک کا ڈھنگ ہی نرالا ہو گیا

○

اب تو قسمت سے یہاں تک حال میرا ہو گیا
پھول بھی گلشن کا میرے حق میں کانٹا ہو گیا

جب سے مجھ سے وہ جدا میرا مسیحا ہو گیا
ہر مرا زخمِ جگر پہلو میں تازہ ہو گیا

یوں محبت سے چڑھائے پھول اس نے قبر پر
مرنے والا اس خوشی میں پھر سے زندہ ہو گیا

تھا ازل میں جب فرشتوں نے اسے سجدہ کیا
رونقِ دنیا وہ پھر مٹی کا پتلا ہو گیا

وقتِ آخر کون آیا میری بالیں پر صفیرؔ
اب مرا دشوار دونوں مرنا جینا ہو گیا

صالح محمد ناؔئب

نام صالح محمد، تخلص ناؔئب۔ والد کا نام ابراہیم، والدہ کا نام بانو بائی۔ صالح محمد ناؔئب ۶/ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو اودے پور ہی میں پیدا ہوئے۔ جب یہ دس سال کے تھے ان کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے ان کی پرورش اپنے نانا جان کے خاندان میں ہوئی۔

صالح محمد ناؔئب اپنے طالب علمی کے زمانے سے شعر کہہ رہے ہیں۔ کسی کو استاد نہیں بنایا، خود ہی اپنا تخلص نائب رکھ لیا۔ نائب صاحب نے ۱۹۵۶ء میں راجپوتانہ یونیورسٹی سے سیاست میں اور ۱۹۷۲ء میں علی گڑھ سے اردو میں ایم، اے کیا۔ لوک مانیہ تلک کالج ڈبوک میں لیکچرار اور بعد میں پرنسپل رہے۔ صالح محمد ناؔئب شعر گوئی کے علاوہ افسانہ نگاری، ناول نگاری مضمون نگاری بھی کرتے ہیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد خدمتِ خلقِ خدا میں مصروف ہیں۔

غزلیں

ہر ہر قدم پہ خار مغیلاں ہے آج کل
کس سے کہیں کہ چاک گریباں ہے آج کل

حیوانیت نے جب سے سنبھالا ہے یہ نظام
انسانیت بے چاری پریشاں ہے آج کل

یارو سنبھل سنبھل کے بڑھانا قدم یہاں
ایک اک قدم پہ موت کا ساماں ہے آج کل

اک دو نشیموں کی نہیں بات دوستو
طوفاں کی زد میں سارا گلستاں ہے آج کل

ظلم و ستم کے دن تو قیامت کی رات ہے
ہر شام، یارو شامِ غریباں ہے آج کل

○

وہ ملا بھی تو اجنبی کی طرح
یعنی انجان سونی گلی کی طرح

نہ خدا کی طرح نہ ولی کی طرح
آدمی ہو، ملو آدمی کی طرح

ایک پتھر کلیجے پہ آ کر لگا
جب ملا مجھ سے وہ اجنبی کی طرح

جب بھی ہم سے ملو، صاف دل سے ملو
یار ہم سے ملو یار ہی کی طرح

اندھیرے میں چمکو دیے سے لگو
جگمگاؤ سدا چاندنی کی طرح

بن کے میرا مجھے روز چھلتا رہا
دشمنی کی مگر دوستی کی طرح

جب بھی ملتا ہے نائبؔ کسی سے کہیں
تو ملتا ہے وہ آدمی کی طرح

سہارا

آج پھر سوچ رہا ہوں سلمیٰ
اپنی کشتی کا میں پتوار بنالوں تم کو
اپنی سوئی ہوئی قسمت کو جگانے کے لیے
ایک تابندہ ستارہ میں بنالوں تم کو
آج بھی کوئی سہارا میری کشتی کا نہیں
گر اجازت ہو سہارا میں بنالوں تم کو

یوں تو کتنے ہی سہاروں کا سہارا لے کر
میں نے سوچا تھا سنور جائے گی دنیا میری
میں نے ہنستے ہوئے ہر گام پہ نغمے چھیڑے
اور سوچا کہ بدل جائے گی قسمت میری
ان گنت بار قلم کا بھی سہارا لے کر
ڈھالی اشعار کے قالب میں کہانی میری
شعر سن، سن کے ملی داد تو محفل میں مجھے
پر کسی نے بھی نہ جانی کبھی حالت میری

○

پھر بھی خلوت سے نکل کر سلمٰی
غمِ دوراں کا سہارا لے کر
لاکھوں ٹوٹے ہوئے دل کے نغمے
میں نے محفل میں سنائے جاکر
اور پھر تم سے ملاقات ہوئی
دو گھڑی پیار بھری بات ہوئی
اور ساحل کو چلی دونوں کی کشتی لیکن
جب کھلی آنکھ تو ہم نے دیکھا
تم کو ساحل، مجھے طوفان ملا
چھن گئے سب ہی سہارے میرے
زندگی تلخ تھی پہلے ہی سنورتی کیسے
ہونٹ پر مہر لگی ایسی کہ کھلتی کیسے

○

آج پھر تم سے ملاقات ہوئی
آنکھوں آنکھوں میں فقط بات ہوئی
تم بھی خاموش ہو میں بھی خاموش
اور خاموش ہے عالم سارا
کاش بن جاؤ تم پھر سے سہارا میرا

شاہد میؔر

نام شاہد میر خاں۔ ادبی نام شاہد میر۔ ۱۰ر فروری ۱۹۴۹ء کو سرونج میں پیدا ہوئے۔ ایم، ایس، سی نباتات (بوٹنی) میں کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج بانسواڑہ میں لیکچرار کی حیثیت سے سرکاری ملازمت اختیار کرلی اور بانسواڑہ میں اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ ادبی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ بانسواڑہ میں ادبی ماحول بنانے میں شاہد میؔر کا اہم رول ہے۔

شاہد میؔر ۶۵۔ ۱۹۶۴ء کے درمیانی وقت سے شعر کہہ رہے ہیں اور ۱۹۷۰ء کے آس پاس سے ان کا کلام ہندوپاک کے رسالوں میں متواتر دیکھا جارہا ہے۔ شاہد میؔر غزل، نظم، دوہے سبھی کچھ کہتے رہتے ہیں مگر بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں ان کی غزلوں کا مجموعہ ''موسم زرد گلابوں کا'' کے نام سے یہیں بانسواڑہ سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ ایک کتاب ''ہفت رنگ'' کے نام سے ترتیب دی جس میں بانسواڑہ کے سبھی شاعروں کا کلام شامل ہے۔ ایک دوہوں کی کتاب بھی ترتیب دے چکے ہیں۔ ان دنوں اپنے وطن سرونج میں مقیم ہیں۔

غزلیں

خشک مٹی میں جو ہم اپنا لہو بو جائیں گے
دیکھ لینا سوکھے جنگل بھی ہرے ہو جائیں گے

سات رنگوں کی سواری بھی نکالی جائے گی
جب کسی معصوم آنکھوں کے دیے سو جائیں گے

اشکِ غم پانی کے کچھ ناچیز قطرے ہیں مگر
دل سے ساری بے حسی کی گرد کو دھو جائیں گے

دورِ پرِ افشاں خالی ہاتھ ٹل سکتا نہیں
ایک دن یہ دل ربا چہرے کہیں کھو جائیں گے

پھر یہ آنسو ہی بنیں گے آسرا اظہار کا
لفظ جس دن خامُشی کی دھند میں کھو جائیں گے

○

وہ زہر تھا دماغ میں اشعار مر گئے
گمنام موت سے سبھی شہکار مر گئے

اس گھر سے صبح شام نکلتا نہیں دھواں
اس شہر میں حیات کے آثار مر گئے

سورج بھی نیند میں تھا اسے اس کی کیا خبر
سائے کی موت ہم پسِ دیوار مر گئے

اُس وقت آسمان پہ چمکا ہے آفتاب
جب سارے روشنی کے طلب گار مر گئے

پتوں سے خشک ہو گئیں ساری رطوبتیں
جھونکے ہواؤں کے سرِ اشجار مر گئے

شاہدؔ بچے ہیں باقی فقط میرؔ کی طرح
اکثر تو اِن کے ساتھ کے بیمار مر گئے

○

کہنہ لفظ نئے مفہوم
اپنی غزلوں کی ہے دھوم
فتنے نئے اٹھاتے ہیں
چہرے لگتے ہیں معصوم
سانسوں کو سنگیت بنا
اپنے من کی تال پہ جھوم
پتی پتی سجدہ کر
آنکھوں سے پھولوں کو چوم
مجھ پر حکم چلاتے ہیں
جو کردار کیے منظوم
پھانس چبھے جب یادوں کی
بادِ سحر ہے بادِ سموم

○

آسماں پر چاند کا خنجر کھلا رہ جائے گا
آنکھ کی پتلی میں یہ منظر کھلا رہ جائے گا

رفتہ رفتہ خاک ہو جائیں گے اجزائے خمیر
کچھ دنوں تک دھوپ اور پتھر کھلا رہ جائے گا

زرد چادر بھی اڑا لے جائے گی آندھی کوئی
ایک دن آئے گا جنگل سر کھلا رہ جائے گا

بند ہو جائیں گے گھر کے سارے دروازے مگر
رینگتی پرچھائیوں کا ڈر کھلا رہ جائے گا

آہنی زنجیر پہنا کر اجل لے جائے گی
اور یہ بازارِ سیم و زر کھلا رہ جائے گا

اس کی یادوں کی رو پہلی چاندنی در آئے گی
دل کا دروازہ جو لمحہ بھر کھلا رہ جائے گا

○

یہی نہیں کہ سبھی خال و خط مٹانے تھے
درخت کو تو نئے برگ و بار لانے تھے

اسی مقام پہ کیں نصب اس کی تصویریں
جہاں چمکتے ہوئے آئینے سجانے تھے

پرندے بیٹھے ہوئے تھے اداس شاخوں پر
ہوائے تیز کی مٹھی میں آشیانے تھے

ہر ایک قید تھی لاحق اڑان بھرنے تک
پھر اس کے بعد کہیں دام تھا نہ دانے تھے

فضول تکتے رہے دوسروں کی جانب ہم
ہمارے پانو کے نیچے بہت خزانے تھے

ہم اپنی پیاس چھپاتے کہاں تلک شاہدؔ
ہوا کے ساتھ گھٹاؤں کے تازیانے تھے

بسمؔل نقشبندی

نام محمد عجب نور، والد کا نام نور محمد۔ ادبی نام بسمؔل نقشبندی۔ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو رتلام (ایم، پی) میں پیدا ہوئے۔ پچھلے ۳۰۔۳۵ سالوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ بسمؔل نقشبندی غزل، نظم اور نعت کے شاعر ہیں۔ مذہبی جلسوں میں دور دور تک بلائے جاتے ہیں۔ آواز بہت اچھی ہونے کی وجہ سے مشاعروں میں بھی بہت کامیاب رہتے ہیں۔ بسمل نقشبندی کے یہاں غزل اپنی روایت کے ساتھ موجود ہے مگر انھیں جدیدیت سے بھی لگاؤ ہے۔ اکثر رسالوں میں ان کا کلام پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ ان کی شاعری کے چار مجموعے ہندی رسم الخط میں مظہر عام پر آچکے ہیں۔ یہ کتابیں اردو دنیا میں بھی بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں، ایک مجموعہ اردو میں "فاس انفاس" کے نام سے بھی شایع ہوا ہے۔

بسمؔل نقشبندی پچھلے تیس سالوں سے بانسواڑہ میں سرکاری ملازمت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

غزلیں

کہیں لہو کہیں خنجر ہوا میں اڑ تا ہے
یہاں تو روز کوئی سر ہوا میں اڑ تا ہے
فلک سے ٹوٹ کر اختر ہوا میں اڑ تا ہے
کہ آج کوئی قلندر ہوا میں اڑتا ہے
تم ایک قطرۂ شبنم کی بات کر تے ہو
صدی یہ وہ ہے کہ پتھر ہوا میں اڑتا ہے
یہ کیسی آندھی ہے ساکت ہے ہر شجر لیکن
بگولہ بن کے مرا گھر ہوا میں اڑتا ہے
کسی کا نامۂ اعمال تو نہیں بسملؔ
یہ کیا ہے جو سر محشر ہوا میں اڑتا ہے

○

اک ایک پل حیات کا ہستی پہ بار ہے
چسپاں ہر ایک چہرے پہ یہ اشتہار ہے
آئے گی تیرگی کے بگولوں میں ناچتی
وہ صبحِ نور جس کا مجھے انتظار ہے
بے چہرہ لوگ ملتے ہیں راہوں میں ہر جگہ
میں آ گیا کہاں پہ یہ کیسا دیار ہے
ملتا ہے روز رات گئے میکدے کے پاس
وہ ایک شخص جو کہ تہجد گذار ہے
بسملؔ وہ رزق دیتا ہے ہر حال میں، مگر
دل پھر بھی مبتلائے غمِ روز گار ہے

○

شیشے کی قدر اور بڑھی پھوٹنے کے بعد
انسان بن گیا کوئی دل ٹوٹنے کے بعد
زندانِ آرزو میں مجھے کردیا اسیر
یاروں نے میرا صبر و سکوں لوٹنے کے بعد
میرے لہو کے داغ نظر آئے صاف صاف
ہاتھوں پہ ان کے رنگِ حنا چھوٹنے کے بعد
انجان رہ گزر میں کہیں کھو گئی حیات
اس مہرباں کا ہاتھ کہیں چھوٹنے کے بعد
پھر ایک نئی زندگی کا ساتھ ہو گیا
بسملؔ بدن سے رشتۂ جاں ٹوٹنے کے بعد

○

شدّتِ غم سے پریشاں ہوں پردیسی ہوں
میں ترے شہر میں انجان ہوں، پردیسی ہوں
مجھ سے نظریں نہ چرائیں تو تیری بستی میں
ایک دو روز کا مہمان ہوں، پردیسی ہوں

میں تری دید کی چاہت میں چلا آیا تھا
اپنی چاہت پہ پشیمان ہوں، پردیسی ہوں

مرے محسن مجھے نفرت کی نگاہوں سے نہ دیکھ
تیرا شرمندۂ احسان ہوں، پردیسی ہوں

حال کیوں پوچھنے آئے کوئی اپنا بسملؔ
دل سے نکلا ہوا ارمان ہوں، پردیسی ہوں

○

نظروں سے گر کے کرب کی دَل دَل میں کھو گئے
سورج تھے پھر بھی رات کے جنگل میں کھو گئے

جب بھی اڑائے ہم نے پرندے نگاہ کے
کچھ دیر اڑ کے وقت کے بادل میں کھو گئے

وہ چند خواب جو کہ تھے سرمایۂ حیات
اک ایک کر کے ذہن کی ہلچل میں کھو گئے

سانسوں پہ یہ طویل سفر طے نہ کر سکے
کچھ لوگ اپنی ذات کے مقتل میں کھو گئے

جو لوگ میرے شہر کے روشن دماغ تھے
بسملؔ وہ اقتدار کی دلدل میں کھو گئے

مضطؔر صدیقی

نام محمد شفیع صدیقی ، والد کا نام محمد اسماعیل صدیقی ، ادبی نام مضطؔر صدیقی ، ۱۴ر دسمبر ۱۹۴۴ء کو کوٹہ میں پیدا ہوئے۔ علیگڑھ سے ادیب کامل اور راجستھان بورڈ سے میٹرک کرنے کے بعد مدھیہ پردیش سے انٹر میڈیٹ کیا اور پھر ملازمت کے سلسلے میں بانسواڑہ آگئے اور یہیں پر سکونت اختیار کرلی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سے شعر کہنے لگے تین چار سال تک شیدؔا کوثری جے پوری کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد باقاعدہ شعر کہنے لگے مضطؔر صدیقی نے نظم، غزل، مراثی ، حمد و نعت سب ہی اصناف میں شاعری کی ہے مگر وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اردو غزل میں کوئی مقام بنالینا کسی بھی شاعر کے لیے دشوار کام ہے۔ مگر مضطؔر صدیقی کے کلام کا پہلا مجموعہ ''ارتعاش'' پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ غزل کے فن میں مہارت رکھتے ہیں۔ غزل کا یہ فن انھوں نے غالبؔ ، اقبالؔ ، اور حالؔی سے سیکھا ہے۔ دوسرا مجموعہ ''اضطراب'' کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔

مضطؔر صدیقی ترقی پسند تحریک کے ہم نوا ہیں۔ اس لیے وہ سردار جعفری اور کیفی اعظمی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ادب میں ترقی پسند رجحان کو فروغ دینا ان کی شاعری کا مقصد کہا جاسکتا ہے۔ ان دنوں بانسواڑہ میں ہی مقیم ہیں اور ادبی خدمات میں مصروف ہیں۔

غزلیں

آپ جب بھی مرے مہمان ہوا کرتے ہیں
لوگ بے وجہ پریشان ہوا کرتے ہیں

آپ کے آنے سے پہلے تو کبھی جانے کے بعد
دور تک راستے سنسان ہوا کرتے ہیں

آپ کے حسن کی تعریف نہیں کر سکتے
آئینے بے حس و بے جان ہوا کرتے ہیں

گانو کے لوگ ہوا کرتے ہیں معصوم بہت
شہر میں ان کے قدر دان ہوا کرتے ہیں

کچھ سمندر میں تو کچھ ہوتے ہیں دل میں مضطرؔ
مختلف قسم کے طوفان ہوا کرتے ہیں

○

نکل کر اپنے جسموں سے جو بے گھر ہو گئے ہوں گے
وہ روحوں کے پرندے عرش یاور ہو گئے ہوں گے

نظر کے لمس سے جو ریزہ ریزہ ہو گئے ہوں گے
وہ شیشوں کے مسیحا سنگ پیکر ہو گئے ہوں گے

خلوصِ دل سے پھر اک بار ہم کو یاد کر لیں گے
اگر احباب کے حالات بہتر ہو گئے ہوں گے

چھپا رکھا تھا جن پُر نور زخموں کو کلیجے میں
عیاں ہو کر وہ مثلِ ماہ و اختر ہو گئے ہوں گے

بہ فیضِ وقت مضطرؔ جو کسی کے قرب میں گذرے
وہ لمحے آج صدیوں کے برابر ہو گئے ہوں گے

○

ہاتھوں میں جب کسی کے کوئی آئینہ نہ تھا
اس وقت اپنی شکل کوئی دیکھتا نہ تھا

طوفاں کی زد سے اس نے سفینہ بچا لیا
جو ناخدا تھا اصل میں وہ ناخدا نہ تھا

باہر نکل کر گھر سے کوئی دیکھتا کیسے
جز میرے شہر میں کوئی بے خانماں نہ تھا

رک رک کے دیکھتا تھا ہر اک سنگِ میل کو
صحنِ سفر میں ساتھ کوئی رہ نما نہ تھا

مضطرؔ جہاں نے چھین لیے دل کے ولولے
ورنہ ازل سے اپنا مزاج عاشقانہ نہ تھا

پریم سوشیل دردؔ

نام پریم سوشیل ابرول، والد کا نام بال کشن ابرول۔ تخلص دردؔ۔ ۲۴ر مئی ۱۹۳۷ء کو ہوشیار پور (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد سرکاری ملازمت میں آگئے اور ۱۹۹۵ء میں اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے سے سبکدوش ہوکر اب جے پور میں رہائش پذیر ہیں۔ اپنے ابتدائی دور میں پریم سوشیل دردؔ نے اپنا کلام ساغر اجمیری کو دکھایا، مگر باقاعدہ طور پر کبھی کسی کے شاگرد نہیں رہے۔ بانسواڑہ میں تیرہ سال تک ''بزمِ ادب'' کے صدر رہے، بانسواڑہ میں ادبی ماحول بنانے میں پریم سوشیل دردؔ کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ ''بزمِ ادب'' کی جانب سے شائع ہونے والی کتاب ''ہفت رنگ'' میں بھی پریم سوشیل درد کا کلام شامل ہے۔

پریم سوشیل دردؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر انھوں نے نظم، گیت دوہے، رباعی اور قطعات بھی کہے ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں ان کا مجموعہ کلام ''صبوحی'' کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے۔ بہت ممکن ہے ان کا ایک اور مجموعہ جلدی ہی منظرِ عام پر آجائے۔

”آگہی“

یہ سن کر ایک دن
سورج سوا نیزے پہ آئے گا
یکا یک برف کی چٹان
اپنی حسیّت کا
قطرہ قطرہ کھو چکی ہو گی
چشمِ آہو جو
کبھی شعلہ بداماں تھیں
وہ آنسو رو چکی ہوں گی
تصور میں
کئی صدیوں پرانے خواب لے کر
سو چکی ہوں گی
پتّھر ہو چکی ہو گی
یہ سن کر ایک دن
سورج سوا نیزے پہ آئے گا

رائیگاں

شہر کی اونچی فصلیں
منتظر ہیں
آج بھی اس وقت کی
جب کوئی قد آور آئے
اور دیکھے
اس مقید سربلندی
کے پرے
کیا ہو رہا ہے
شہر کے باہر
کہاں تک روشنی ہے

غزلیں

صورتِ مہروہ رخشندہ خیالات میں تھے
حادثے قید جو صدیوں سے حجابات میں تھے

درس دیتے تھے جو دنیا کو فرشتوں کی طرح
ہوش آیا تو گناہوں کے طلسمات میں تھے

مجھ کو سمجھا تھا زمانے نے مکمل لیکن
نقص صد قابلِ تردید مری ذات میں تھے

آج نکلے ہیں سرِ راہ اجالے لے کر
لوگ جو صدیوں سے تاریک مکانات میں تھے

زندگی برف کے خاموش حصاروں میں رہی
تجربے تند ہواؤں کے اشارات میں تھے

آپ نے جن کے تقدس کی قسم کھائی تھی
تادمِ مرگ وہی پھول مرے ہاتھ میں تھے

پائے ساقی پہ لٹا بیٹھے جو ہستی اپنی
حضرتِ دردؔ بھی شامل انھیں حضرات میں تھے

نہ آسکا کوئی ماحول ساز گار مجھے
کسی جگہ بھی نہ حاصل ہوا قرار مجھے

بسے ہو جب سے مرے چشم و دل میں تم آکر
خود اپنے آپ سے ہونے لگا ہے پیار مجھے

مسرتوں نے کیا بھی اگر جو بے ترتیب
تراش دے گی مرے غم کی آبشار مجھے

یہ ابتدائے وفا ہے کہ انتہائے جنوں
کہ اب نہیں کسی شے کا بھی انتظار مجھے

قبول کیوں نہ کروں دردِ غم زمانے کے
ازل سے جب کہ ملا دل ہی غمگسار مجھے

احوال کیا کہوں دلِ صحرا نورد کا
میں خود ہی ہوں شکار مری آہِ سرد کا

کیا راز فاش ہو بھلا رخسارِ زرد کا
غازہ ملا ہے چہرۂ ہستی پہ گرد کا

گل رنگ جتنے چہرے تھے بے آب ہو گئے
چھیڑا کسی نے ذکر جو رخسارِ زرد کا

اپنا ہی جسم دیکھ کے شرما رہے ہیں وہ
دیکھا تھا جس نے خواب گرانڈیل مرد کا

کیسے حصارِ غم سے جدائی نصیب ہو
دل سے ملا ہے سلسلہ زنجیر درد کا

○

ہم بے کسی و یاس کے پیکر بنے رہے
گویا کسی کی راہ کے پتّھر بنے رہے

صدیاں سمٹ کے ہو گئیں لمحوں میں منجمد
شبنم کے چار قطرے سمندر بنے رہے

وہ زندگی کا کارواں لے کر گذر گئے
اور ہم کہ صرف میل کا پتھر بنے رہے

دنیائے رنگ و بُو میں وہ اب ہو چکے ہیں گم
کل تک جو اپنی قوم کے رہبر بنے رہے

سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا ایک بار
آنکھوں میں دیر تک وہی منظر بنے رہے

لکھ لکھ کے جس نے چاہا مٹاتا رہا ہمیں
ہم عمر بھر اک حرفِ مکرّر بنے رہے

آئے گا دردؔ ہم کو بھی آزر تراشنے
اس دن کے انتظار میں پتّھر بنے رہے

دنیا کے حادثات نے اے زندگی مجھے
چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے ابھی مجھے

میں اس کی بزمِ ناز میں پہنچا ہوں بارہا
دیوانگیِ شوق اڑا لے گئی مجھے

مڑ مڑ کے دیکھتا ہے کیوں ہر اک مری طرف
اے گردشِ حیات کہاں لے چلی مجھے

اکثر خیالِ یار نے مسرور کر دیا
اکثر خود اپنے آپ سے وحشت ہوئی مجھے

اے دردؔ یوں ہوا کہ پشیمان ہو کے وہ
رونے لگے تھے اور ہنسی آ گئی مجھے

مضطرؔ صدیقی بسملؔ نقشبندی۔ شاہدؔ میر اور پریم سوشیل دردؔ بانسواڑہ میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں آئے اور اس طرح یہاں کے عوام میں رس بس گئے کہ یہ کہنا بہت مشکل ہو گیا کہ یہ حضرات کہیں اور سے آکر یہاں رہ رہے تھے۔ (پریم سوشیل دردؔ ان دنوں جے پور میں اور شاہد میر سرونج میں مقیم ہیں) ان کی مشترکہ کوششوں نے بانسواڑہ میں ادبی ماحول بنانے میں بڑی مدد کی۔ یہاں آج جو ادبی ماحول بنا ہوا ہے یہ انھیں حضرات کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کی آمد کے بعد جو شعرا ابھر کر سامنے آئے ان تمام لوگوں کا ذکر میں اپنے پیش لفظ میں کر چکا ہوں مگر ایسے شعرا جو اپنی پہچان بنانے میں کسی حد تک کامیاب رہے ہیں میں ان کا کلام یہاں نمونے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ تاکہ بانسواڑہ کی زمین سے ابھرنے والے شعرا کی نمائندگی ہو سکے۔ سعید روشن، سعید منظر، ظہیر آتش اور گھنشیام داس نورؔ کا کلام نمونے کے طور پر پیش ہے۔

سعید روشن

نام سعید گل خاں ۔ ادبی نام سعید روشن ، ۲ر دسمبر ۱۹۵۶ء کو بانسواڑہ میں پیدا ہوئے۔ علیگڑھ سے ادیب کامل کرنے کے بعد سعید روشن نے لندن سے سیاحت و سفر اور تجارت میں ڈپلومہ اور ایم ، پی ، اے تجارت میں امریکہ سے اور پھر ایم ، بی ، اے آئر لینڈ سے انسانی حقوق میں کیا۔ کویت سے ''کمپیوٹر پروگرامر'' کا ڈپلومہ کیا۔ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد اب کمپیوٹر پروگرامر کی حیثیت سے کویت میں ملازمت کر رہے ہیں۔

۱۹۷۰ء کے آس پاس شاعری شروع کی۔ ابتدائی دور میں شاہد میر کو اپنا کلام دکھایا۔ ۱۹۷۵ء سے ہندوپاک کے علاوہ بیرونی ملکوں سے نکلنے والے اردو رسالوں میں کلام چھپتا رہا ہے۔ کئی شعری انتخاب میں ان کا کلام شامل ہے۔ خاص طور پر شاہد میر کی ترتیب دی ہوئی کتاب ''ہفت رنگ'' اور ''بین الاقوامی شاعر'' (لاہور۔ ۱۹۹۸ء) کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ مطالعہ بہت وسیع ہے کافی تعداد میں پاکستان سے کتابیں اور رسالے ان کے پاس آتے رہتے ہیں۔ اب تک ان کی اپنی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے مگر ان دنوں وہ اپنا مجموعۂ کلام ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔

منتخب اشعار

کیا خوب نبھاتا ہے محبت کے وہ رشتے
نظروں میں رہے اور جدائی بھی مجھے دے
زنجیر بھی باندھے مرے پیروں میں وہ روشن
منصف کی طرح حکمِ رہائی بھی مجھے دے

....

سورج کی خواہشوں کی جہاں گفتگو رہی
اک خوشگوار شام مرے روبرو رہی
دیوار دے سکی نہ سہارا مکان کو
بارش کے ساتھ تیز ہوا چارسو رہی

....

سفر میں دور تک سائے نہیں ہیں
مگر ہم پھر بھی گھبرائے نہیں ہیں

....

اذاں گونجی رنگِ سحر جاگ اٹھا
پرندے اڑے تو شجر جاگ اٹھا

....

کھینچتے ہیں دل کو یہ پربت بہت
روکتی ہے مجھ کو میری چھت بہت
عمر تو ساری کٹی پردیس میں
گانو جانے کی ہے اب حسرت بہت

....

مجھ کو جو تھی عزیز، ہوا ساتھ لے گئی
پتوں کے ٹوٹنے کی صدا ساتھ لے گئی

....

اتار کر کسی کاغذ پہ سب گھٹن رکھ جا
جہاں کے سامنے اپنا عروجِ فن رکھ جا

....

اس سے بڑھ کر زندگی کا سانحہ کوئی نہ تھا
میری بستی میں مجھے پہچانتا کوئی نہ تھا

....

گئی رتوں کی مثال دینا
مگر نیا سا خیال دینا
میں لہجہ اپنا بدل چکا ہوں
تو دل سے تلخی نکال دینا

....

وہ ہواؤں سے لڑی ہے یارو
شاخ جو ٹوٹ پڑی ہے یارو
کھا چکی ساری جوانی لیکن
مفلسی پھر بھی کھڑی ہے یارو

ظہیر آتشؔ

غزلیں

بدلے ہیں زندگی نے کئی بار راستے
لیکن نہ مل سکے کبھی ہموار راستے

مجھ سے ملے ہیں منزلِ مقصود کے نشاں
میرے لہو سے ہو گئے گلزار راستے

ویرانیوں میں چھوڑ کے روپوش ہو گئے
مجھ کو دکھا رہے تھے جو مینار راستے

چلتے ہیں ساتھ ساتھ ہمارے قدم قدم
ہم سے مسافروں کے ہیں غمخوار راستے

غمِ حق لیے ہوئے نکلے جو شہسوار
آتشؔ سمندروں سے ہوئے پار راستے

بہت تھے جہاں میں دیوانے ترے
پڑے ناز ہم کو اٹھانے ترے

وہی پُر تکلف شکایت مری
وہی خوبصورت بہانے ترے

بنے ہیں مری زیست کا آسرا
شب و روز سپنے سہانے ترے
وہیں تھم گئی ہے مری زندگی
جہاں یاد آئے زمانے ترے
بہت خاک آتش نے چھانی مگر
ملے نہ کہیں بھی ٹھکانے ترے

○

دن گذرتے گئے وقت ڈھلتا گیا
اور چہرہ ہمارا بدلتا گیا
موم کی ایک مورت تھا اس کا بدن
جتنا جلتا گیا ہے پگھلتا گیا
راستے بھر کوئی یاد آتی رہی
ہر قدم پر مرا دل مچلتا گیا
آرزو چند پھولوں کی دل میں لیے
آگ پر مجھ کو چلنا تھا، چلتا گیا
وقت نے ہر قدم پر سکھایا سبق
ٹھوکریں کھا کے آتشؔ سنبھلتا گیا

سعید منظر

غزلیں

نہ شور و غل نہ رنج و غم فقط خاموشیاں ہوں گی
نگر سے دُور جنگل میں سکوں کی بستیاں ہوں گی

جو ہو تم دور ، تو ہیں مہرباں تنہائیاں مجھ پر
تم آئے پاس تو روٹھی ہوئی تنہائیاں ہوں گی

ہمارے جذبِ الفت میں کمی کوئی نہ تھی پھر بھی
نہ آئے وہ تو کچھ پیشِ نظر مجبوریاں ہوں گی

ہمیں بھی اپنے بھولے بسرے لمحے یاد آتے ہیں
کسی کے در پہ جب بجتی ہوئی شہنائیاں ہوں گی

نہ گھبراؤ سعید اس سر پھرے طوفاں سے ٹکراؤ
کنارے سے لگی اک دن تمھاری کشتیاں ہوں گی

○

نظروں میں پھول ہیں چمن کی بہار ہے
مجھ پر تو آج کل کرمِ روزگار ہے

اے یادِ یار تیرا ہی کچھ اعتبار ہے
ورنہ جہاں میں کون مرا غمگسار ہے

میں نے رواروی میں لیا تھا کسی کا نام
وہ یہ سمجھ رہا ہے مجھے اس سے پیار ہے

عارض کھلے گلاب تو آنکھیں کنول کے پھول
تُو وہ چمن ہے جس پہ مسلسل بہار ہے

وہ آئیں یا نہ آئیں مگر آج تو سعیدؔ
آجائے موت ہی کہ شبِ انتظار ہے

O

شامِ غمِ فراق کا مارا ہوا ہوں میں
اب جا کے اس کی آنکھ کا تارا ہوا ہوں میں

دیتا ہوں ہر بشر کو مصیبت میں آسرا
ہر بار کشتیوں کا کنارا ہوا ہوں میں

بہتر ہے اب یہی مجھے تنہا نہ چھوڑیے
اک عمر خلوتوں میں گذارا ہوا ہوں میں

شاید مری حیات کے دن ختم ہو گئے
پھر آج اس کو جان سے پیارا ہوا ہوں میں

آخر ملا سعید مری زیست کو دوام
کہتا ہے کون موت کا مارا ہوا ہوں میں

گھنشیام داس نورؔ

غزلیں

پتا گرا تو کیسے، ہوا تو چلی نہ تھی
ایسی تو واردات چمن میں ہوئی نہ تھی

احساس اب ہوا ہے جو ہم سے بچھڑ گیا
کہتے ہیں لوگ اب کہ وہ ہستی بری نہ تھی

بھولے سے ایک تارا چمکتا نہیں کہیں
ایسی اندھیری رات تو پہلے ہوئی نہ تھی

شاید ٹھہر ہی جاتا جو اس کو پکارتے
سورج چھپا تو اس کو صدا ہم نے دی نہ تھی

اے نورؔ بوجھ بن گئی آخر کو زندگی
حالت ہماری ایسی تو پہلے کبھی نہ تھی

کیا چیز ہے زمین فلک پر بھی چھا گیا
گردو غبار شہر کو اندھا بنا گیا
ادنیٰ سمجھ رہے تھے جسے لوگ شہر کے
انسانیت کا قرض وہ تنہا چکا گیا
خود منزلوں سے دور رہا وہ تو عمر بھر
ہر ایک راہ گیر کو رستہ دکھا گیا
کانٹے تمام بھر لیے دامن میں نوؔر نے
ہر ایک رہ گزر کو گلوں سے سجا گیا

غم کے بادل پھر سے منڈلانے لگے
پاس سے جو اٹھ کے وہ جانے لگے
کچھ نہیں جن کو مستقبل کی فکر
مجھ کو تو وہ لوگ دیوانے لگے
بھولنے کی جس قدر کی کوششیں
اور بھی وہ مجھ کو یاد آنے لگے
چل نہیں پائے کبھی خود جن پہ لوگ
راستہ وہ مجھ کو دکھلانے لگے
کوئی بھی غم کا نہ درماں کر سکا
شہر میں ہر سمت بے گانے لگے

اقبال انجمؔ

نام اقبال احمد شاہ، والد کا نام امیر احمد شاہ۔ پہلے ہندی میں اقبال سیلانی کے نام سے گیت لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں جب خلیل تنویر ڈونگر پور میں تھے تو ان کے زیرِ اثر جدید شاعری کرنے لگے۔ اور اپنا ادبی نام اقبال انجم رکھ لیا۔ اور ۱۹۷۴ء سے باضابطہ طور پر اردو میں شعر کہنے لگے۔

اقبال انجم کے پسندیدہ شعرا میں احمد فراز شکیب جلالی، ناصر کاظمی بانی، زیب غوری اور محمد علوی رہے ہیں۔ جن کا اثر ان کی غزلوں میں دیکھا جا سکتا ہے شاید میرؔ کی ترتیب دی ہوئی کتاب "ہفت رنگ" میں ان کا کلام شامل ہے۔ ۱۹۷۵ء سے برابر ہندو پاک کے رسالوں میں چھپ رہے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ جلد ہی ان کا شعری مجموعہ مظر عام پر آجائے۔ ان دنوں ساگواڑا میں اپنی سرکاری ملازمت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

غزلیں

زیست بے برگ و ثمر ہو جیسے
کوئی برباد شجر ہو جیسے

ڈوب جاتا ہے ہر اک منظرِ خواب
تیری آنکھوں میں بھور ہو جیسے

کوئی دو پل بھی ٹھہرتا ہی نہیں
دل کہ اجڑا ہوا گھر ہو جیسے

یوں خلاؤں میں تکا کرتے ہیں
دور تک راہ گذر ہو جیسے

○

نہ کوئی عکس نہ آواز نہ چہرہ ہوگا
دور تک ایک جھلستا ہوا صحرا ہوگا

کچھ تو آیا ہے نظر میں وہ دھندلکا ہی سہی
شام ہوگی تو دھواں اور بھی گہرا ہوگا

منتظر کس لیے اب تک ہیں چراغوں کی لویں
وہ مسافر تو کہیں اور جا ٹھہرا ہوگا

یہ اجڑتے ہوئے جنگل یہ غبار اور یہ پیاس
لوگ کہتے ہیں کسی دن یہاں صحرا ہوگا

مان بھی جاؤ کہ سر پر ہے کڑی دھوپ ابھی
ڈوبتی شام کا ہر رنگ سنہرا ہوگا

○

درد جب حد سے گذر جائے گا
غم کا احساس بھی مر جائے گا

تیری آنکھوں کے گھنے جنگل سے
جو بھی گذرے گا ٹھہر جائے گا

اپنے ہی جسم کے تہہ خانوں میں
کوئی اترا بھی تو ڈر جائے گا

عمر تو بیت گئی راہوں میں
جانے کس روز وہ گھر جائے گا

جن سے مل کر ہے بہت خوش انجمؔ
ان سے بچھڑا تو کدھر جائے گا

○

دور تا حدِّ نظر افق منظر سنہرا ہو گیا
رفتہ رفتہ شام کا ہر رنگ گہرا ہو گیا
یا تو آہٹ کوئی مجھ تک پہنچ پاتی نہیں
یا مرے اندر کا سارا شہر بہرہ ہو گیا
ایک اک کر کے ہر اک تصویر دھندلاتی گئی
جب اداسی کا کنواں کچھ اور گہرا ہو گیا
کیا کہوں کس شہر کی ویرانیاں آنکھوں میں تھیں
جس گھنے جنگل سے میں گذرا وہ صحرا ہو گیا

○

جھونکے ہوائے تند کے جب بھی ادھر گئے
جتنے مکاں تھے ریت کے سارے بکھر گئے
جب بھی لگا ہے خوف ہمیں اپنے آپ سے
ہم بستیوں کے پاس سے ہو کر گذر گئے
وہ کون تھا جو راہ میں ہم سے بچھڑ گیا
ہم پھر اداسیوں کے بھور میں اتر گئے
اک عمر ہو گئی ہے اُدھر دیکھتے ہوئے
خوابوں کے بدحواس پرندے جدھر گئے
سورج کو ہم نے غور سے دیکھا تھا ایک دن
کتنے اندھیرے آنکھ کی پتلی میں بھر گئے

معصوم نظر

معصوم نظر ۱۹۷۵ء کے آس پاس سے جدید شعر کہہ رہے ہیں اس سے پہلے وہ نعت لکھا کرتے تھے مگر جب ۱۹۷۳ء میں خلیل تنویر اپنے ساتھ ''شبخون'' لے کر ڈونگرپور پہنچے تو وہاں کے نئے لکھنے والوں میں ایک نیا شعور بیدار ہوا اور وہ نئے ادب کی طرف راغب ہو گئے۔

معصوم نظر کیونکہ بہت ذہین ہیں اس لیے کسی بھی نئے تجربہ کے لیے تیار رہتے ہیں اور نئے سے نیا کہنے کی فکر لگی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بہت کم مدت میں بہت کچھ تخلیق کیا ہے۔ معصوم نظر اپنے آپ کو نظم کا شاعر کہنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں مگر ان کی غزل میں بھی نئے تیور ملتے ہیں۔ کوئی بھی بحر ہو کسی بھی طرح کا مضمون ہو اسے نظم کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ باتیں ایک دم صاف صاف کرتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی نثر اور ناصر کاظمی کی غزل کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں شکیبؔ جلالی، باقیؔ اور محمد علویؔ کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔

سمت سفر

سفر کرتی ہوئی
ریل کے ڈبوں کی کھڑکیوں سے
جھانکتی ہوئی خواہشیں
اترتی ہیں
ملتی ہیں
کسی اسٹیشن پر
ایک دوسرے کا
تعارف کراتی ہوئی
مسافتوں کے گناہوں میں
ڈوبتی ہوئی نگاہیں
دیکھتی ہیں ریل کو
ریل جو بچوں کی طرح
اشارہ کرتی ہے
دوڑنے کا
ڈبّوں کو پکڑنے کا
منزل تک
پہنچنے کا

غزلیں

پڑا ہوں راہ میں چلنے کا کچھ ہنر بھی دے
قریب آؤں میں کیسے تو رہ گذر بھی دے

دکھائی دے کوئی منزل تو میں ٹھہر جاؤں
شبِ سیاہ گراں ہے ذرا سحر بھی دے

بڑی کٹھور مسافت ہے مستقل یوں ہی
نکل سکوں میں اذیّت سے وہ سفر بھی دے

تمام دشت ہے صدیوں سے منتظر تیرا
ترے وجود کی اے رت نئی خبر بھی دے

سوچتا ہوں جگمگاتا دن سہانا آئے گا
گھپ اندھیری راہ میں کوئی ٹھکانہ آئے گا

کیا کبھی کم ہو سکیں گے درمیانی فاصلے
مسکرا کر بات کرنے کا زمانے آئے گا

آج اپنے دل کا دروازہ کھلا رکھنا ذرا
یاد کچھ تم کو دِلانے غم پرانا آئے گا

بات کرنے کا سلیقہ جو کبھی رکھتا نہیں
کیا کبھی اس کو کسی سے دل لگانا آئے گا

جب کبھی ان کی طبیعت میں روانی آئے گی
پھر بلاوے کا کبھی کوئی بہانا آئے گا

۱۹۷۳ء میں جب خلیل تنویر اپنی ملازمت کی وجہ سے ڈونگر پور میں مقیم تھے تو انھوں نے وہاں کے نئے لکھنے والوں کو جدید ادب کی طرف رجوع کیا۔ یہاں ادبی رسائل آنے لگے خاص طور پر "شبخوں" کی آمد نے بڑا کام کیا۔ اقبال انجم اور معصوم نظؔر نے جدید ادب کو اپنے قریب پایا اور جلد ہی نئے انداز میں شعر کہنے لگے اقبال انجم اور معصوم کے بعد کچھ اور لوگ بھی جدیدیت میں دلچسپی لینے لگے ان میں مقبول رضؔا اسماعیل نثؔار، جگجیت سنگھ نشاؔط کے نام لیے جا سکتے ہیں

اقبال انجم اور معصوم نظر ۱۹۷۵ء کے بعد سے متواتر رسالوں میں دیکھے جا رہے ہیں مگر دیگر حضرات کو ابھی اور وقت درکار ہے۔ مجھے امیدّ ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ان ناموں کے بغیر ڈونگر پور کا ادبی نامہ نامکمّل لگے گا۔ میں نمونہ کے طور پر ان کا کلام پیش کر رہا ہوں۔

مقبول رضؔا

پھر فضاؤں میں یہ دھواں کیوں ہے
دھند میں کھو گیا مکاں کیوں ہے

جا چکے دور کے مسافر جب
ذہن میں یادِ رفتگاں کیوں ہے

موسمِ نو بہار ہے ہر سو
پھر بھی بے رحم یہ خزاں کیوں ہے

بے سبب یہ سکون دریا میں
اک ندی آگ کی رواں کیوں ہے

آگ تم نے تو دی نہیں اس کو
پھر رضا زخمِ فروزاں کیوں ہے

جگجیت سنگھ نشاطؔ

کل جو گذرا ہڑتالوں میں گھیراؤ میں نعروں میں
سچا جھوٹا چھپا ہوا ہے پڑھ لو ان اخباروں میں

تو نے کتنے قید کیے ہیں میں نے کتنے قید کیے ہیں
کیسی ہوڑ لگی ہے دیکھو ان چھوٹی دیواروں میں

شور مچاتی بھیڑ دیکھ کر ایک ڈاکٹر کہتا ہے
ایک انار بٹے گا کیسے ان لاکھوں بیماروں میں

اپنوں کو جو چاہے دے دو اوروں کو کچھ مت دینا
فرق نہیں ہوتا ہے زیادہ سرکاروں سرکاروں میں

گھر گھر آنگن گھوما چولہا چولہا چھان چکا
یہ سردی کیسے گذرے گی آنچ نہیں انگاروں میں

جانے کیوں کہتے ہیں اکثر مجھ کو میرے دوست نشاطؔ
تیرے جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں سرداروں میں

نظم ☆ اسماعیل نشاطؔ ☆

کچھ لوگوں نے
میری آنکھوں پر
پٹّی باندھ کر
میرے اپنے ہاتھوں میں
پتھر تھمادیے ہیں
جب سارے پتھر پھینک چکا
اور آنکھوں سے
پٹی کھول کے دیکھا تو
میرا گھر ہی
لمحہ لمحہ ٹوٹ رہا تھا

سُرنگ ☆ اصرار احمد ☆

اندھی سرنگوں میں
دوڑتی ہوئی زندگی
کوئی مسیح ڈھونڈتی ہے
یوں تو تنکوں میں
بکھری ہوئی لگتی ہے
اور کہیں جسم کے کمرے میں
مدّت سے سویا ہوا
اک درندہ جاگتا ہے
اور جنگل کی جانب بھاگ کر
آدم خور بستیوں میں
سڑکوں اور گلیوں میں
رقص کرتے ہوئے
بکھیر دیتا ہے کئی لوگوں کا وجود
فضاؤں کے کورے دامن پر
نہ جانے کتنے سیاہ سرخ
دھبّے ابھرتے ہیں
آواز دیتے ہیں
گھٹ کے مرتے ہیں سرنگیں
اور بھی گہری ہونے لگتی ہیں
اور ہاتھوں کی
لکیروں سے
مسیح کا پتہ پوچھتی ہیں
زندگی بس یوں ہی دوڑتی ہے

میکش اجمیری

نام محمد یونس نیازی ۱۵ر ستمبر ۱۹۴۱ء کو اجمیر میں پیدا ہوئے۔ اپنے وال
ساغر اجمیری سے تلمذ اختیار کیا اور اپنا تخلص میکش رکھا شاعری کی شروعات ۱۹۵۶ء میں ہوئ
غزلوں کا ایک مجموعہ "پتھروں میں پھول" کے نام سے مظر عام پر آچکا ہے۔ میکش صاحب
کلام ہندوستان کے رسالوں میں متواتر چھپتا رہتا ہے۔ علمی سنگم اور بانی بزم ساغر کے ز
اہتمام کئی کل ہند مشاعرے کروا چکے ہیں۔ ایک کام جو میکش صاحب نے شمبا ہیڑے میں ک
ہے جس کے لیے یہاں کے لوگ انھیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ وہ یہ ہے کہ ان کی کوششوں
یہاں کے اسکولوں میں اردو تیسری زبان کے طور پر پڑھائی جانے لگی ہے۔ میکش صاحب
اردو اکادمی جے پور کے علاوہ دوسرے کئی اداروں نے بھی انعامات سے نوازا ہے۔

غزلیں

میری صداقتوں کا جسے اعتراف تھا
سب کی طرح وہ شخص بھی میرے خلاف تھا

کوئی نہ جان پایا مرے دل کی کیفیت
میری اداسیوں پہ خوشی کا غلاف تھا

بستر پہ نیند آتی تو کیسے غریب کو
سردی میں کپکپاتا بدن بے لحاف تھا

تو میرے ساتھ تھا تو زمانہ تھا میرے ساتھ
تو ہو گیا خفا تو زمانہ خلاف تھا

میکش طواف کرتا نہ کیوں کوئے یار کا
زاہد حرم میں حلقۂ گر اعتکاف تھا

○

آپ کی جھولی تو بھر دی جائے گی
شخصیت مجروح کر دی جائے گی

سرد جذبِ عشق ہے جن کا انھیں
گرمیِ خونِ جگر دی جائے گی

وہ جو کالی کوٹھری میں بند ہیں
ان کو پھانسی پر سحر دی جائے گی

زندگی کے ساتھ ہے ہر روز غم
یہ سزا تو عمر بھر دی جائے گی

حسنِ ساقی پائے گا نمبر ہزار
عشقِ میکش کو صفر دی جائے گی

رباعیات

ہر وقت ہے اندیشۂ فانی دیکھو
کس طور سے ڈھلتی ہے جوانی دیکھو
جذبات کی دنیا ہوئی نذرِ سیلاب
دیکھو مرے اشکوں کی روانی دیکھو

تقدیر کا رخ روز پلٹتے دیکھا
ہر پھول کے دامن کو سمٹتے دیکھا
ٹھہرا کسی مرکز پہ نہ دنیا کا نظام
مہتاب کو بڑھتے کبھی گھٹتے دیکھا

قطعات

صبحِ رنگیں کے خیر مقدم کو
بن کے سورج نکل رہی ہو گی
چاند تاروں نے موند لیں آنکھیں
رات کپڑے بدل رہی ہو گی

کتنے طوفاں دبا کے میں غم کے
آنسوؤں کو چھپا کے پیتا ہوں
تو نہ ساقی اداس ہو جائے
اس لیے مسکرا کے پیتا ہوں

دوہے

آج اچانک راہ میں اس سے ہوئی یوں بات
پیاسے ریگستان پہ جیسے ہو برسات
جس بیری نے دل لیا شکل اسی کی بھائے
بن دیکھے اب دوستو چین مجھے نہ آئے
گلشن گلشن پھول ہیں صحرا صحرا خار
ان دونوں کا نور ہے من مندر میں یار
کر کے جلدی فیصلہ اب سے ناطہ جوڑ
پریم بھاؤ سے کام لے بھید بھاؤ کو چھوڑ
دُور گگن کی چھاؤں میں ہے بادل کا شور
یار ملن کی آس میں ناچ رہا ہے مور